پنڈت جواہر لال نہرو
کا
مذہب

مولانا شبیہ الحسنین محمدی

پنڈت جواہر لال نہرو

کا

مذہب

مولانا شبیہ الحسنین محمدی

فہرست مضامین

دوبارہ اشاعت کیوں؟

میرا زیر نظر رسالہ "پنڈت جواہر لال نہرو کا مذہب" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا مرحوم راجہ صاحب محمود آباد محمد امیر احمد خان نے اس کو نظامی پریس لکھنؤ سے طبع کرا کے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کرایا تھا نہرو پرست مسلمانوں پر اس کتابچہ نے بڑا گہرا اثر ڈالا اور ہزاروں مسلمان کانگریس اور اس کی ذیلی مسلم جماعتوں کو چھوڑ کر مسلم لیگ کے پرچم تلے آگئے اس وقت بہت سے مسلمان اخبارات "زمیندار" "انجام" "الامان" "وحدت" "احسان وغیرہ" مسلم لیگ کی حمایت کر رہے تھے۔ لیکن کتابوں اور رسالوں کی شکل میں بہت کم لٹریچر شائع ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں معروف مفکر اور انشاء پرداز محترم عبدالوحید خان صاحب سابق وزیر اطلاعات نے "جنگ آزادی" کے نام سے ایک چھوٹا سا پمفلٹ شائع کیا تھا۔ (جو شاید آج کل ایک بہت بڑی کتاب میں تبدیل ہو چکا ہے) اس کتابچہ

اور محترم عبدالوحید خان صاحب کی "جنگ آزادی" نے تحریک پاکستان کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ میرا یہ رسالہ تقریباً ناپید ہو چکا تھا۔ میرے پاس بھی اس کی کوئی کاپی نہ تھی۔ اتفاقاً میرے عزیز دوست مولانا سید سجاد حسین صاحب بخاری پرنسپل مدرسہ تعلیمات آل محمد بھائی پھیرو دسمبر ۱۹۸۳ء میں بغرض سیاحت ہندوستان گئے اور مراد آباد کے ایک بزرگ نے یہ رسالہ برائے مطالعہ ان کو دیا۔ موصوف یہ رسالہ ان سے مانگ کر اپنے ساتھ پاکستان لے آئے اور جنوری ۱۹۸۴ء میں میرے حوالہ کر دیا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی تو محسوس کیا کہ اس کو دوبارہ شائع کر دیا جائے تاکہ نئی نسل اور تحریک پاکستان کی دشواریوں سے ناواقف لوگوں کو تھوڑا بہت احساس ہو سکے کہ کن مشکلات میں تحریک کو منزل تک پہنچایا گیا ہے یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کو غلام بنانے اور رکھنے کے لئے سفید فام بنیوں کے تعاون سے سیاہ فام بنیوں کی سازشوں کا عالم کیا تھا اور مسلمان کس حد تک غلامی کی دلدل میں پھنس چکا تھا۔ اگر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں برصغیر کی امت مسلمہ کو پاکستان کے قیام پر آمادہ نہ کرتی تو دائمی غلامی ہمارا نصیب ہوتی۔

اور اس ذیل میں چند جملے اپنے سیاسی سفر کے متعلق: مسلم لیگ سنہ ۱۹۰۶ء میں وجود پذیر ہوئی لیکن سنہ ۱۹۳۷ء تک بڑے لوگوں کی جماعت

سمجھی جاتی رہی تاہم سنہ ۱۹۳۰ء سے اس کا کردار عوامی ہونا شروع ہو گیا تھا اور یہ عام مسلمانوں کے دل و دماغ میں جگہ پانے لگی تھی۔

علامہ محمد اقبال کی زیر صدارت اجلاس الٰہ آباد نے عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کی طرف متوجہ کر دیا یہ علامہ مرحوم کی محبوبیت اور عظمت کا ردعمل تھا مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر مسلم لیگ مسلمانوں کے لئے اہم اور مفید جماعت نہ ہوتی تو وہ اس کی صدارت نہ فرماتے۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا شباب شروع ہوا اور اجلاس لکھنؤ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء (اس جلسہ کے ہر طرح کے اخراجات راجہ صاحب نے برداشت کئے تھے اور تمام شرکاء در راجہ صاحب محمود آباد کے ذاتی مہمان تھے اور جب تک کوئی شخص لکھنؤ میں رہا راجہ صاحب کی فیاضانہ میزبانی سے لطف اندوز ہوتا رہا) میں مسلم لیگ کی محبت ہر کہ و مہ کے دل میں پیدا ہونے لگی۔ صرف وہ مسلمان بر سر عناد یا کھنچے رہے جو متحدہ قومیت کے نشہ میں چور یا کانگریس سے بوجوہ وابستہ تھے۔ میں سنہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوا اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہندوستان کے شیعہ علماء معلوم نہیں کیوں عملی سیاست سے دور

رہتے تھے۔ تاہم اپنی پسندیدہ جماعت کے حق میں اظہار رائے میں بھی تکلف نہیں کیا کرتے تھے (آج کل حضرت آیت اللہ خمینی مدظلہٗ سے متاثر ہو کر شیعہ علماء میدان سیاست میں کود پڑے ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر تقلیدی کردار کے ساتھ) اس رسم کہن کے خلاف علامہ سید ابن حسن صاحب جارچوی نے نے مجھ سے بہت پہلے عملی سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ میں ۱۹۳۲ء میں رسمی تعلیم سے فارغ ہو کر لکھنؤ سے لدھیانہ آچکا تھا تاکہ علامہ سید محمد سبطین صاحب سے تفسیر و حدیث اور علوم عقلیہ میں خصوصی استفادہ کروں۔ علامہ سید محمد سبطین صاحب سرسوی اعلی اللہ مقامہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں عربی فارسی شعبہ کے سربراہ تھے اور حکومتی ملازمت کے باوجود کانگریس سے انتہائی بیزار اور مسلم لیگ سے بیحد انس رکھتے تھے میں ان کی صحبت اور تربیت کے نتیجہ میں اور ایک حد تک ان کی خواہش کے مطابق۔ شیعہ علماء کی روایات کے خلاف عملی سیاسیات میں داخل ہو گیا۔ علامہ سید محمد سبطین صاحب مرحوم اگر آزاد ہوتے تو یقیناً عملی سیاست میں حصہ لیتے تاہم انہوں نے اس تعلق میں اپنے رسالہ "البرہان" میں بڑے مفید اور قیمتی مضامین لکھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علامہ سید محمد سبطین صاحب مرحوم کا سیاست سے یہ شغف سرکار علامہ شیخ عبدالعلی ہروی طہرانی کی صحبت کا فیضان تھا۔ علامہ ہروی قاچاری دور میں ایران کے وزیر خارجہ

تھے۔ انگریزوں سے اختلافات کے نتیجہ میں جلا وطن کر دیئے گئے۔ عراق ترکی، مصر وغیرہ میں کچھ عرصہ گزار کر ہندوستان آگئے اور لاہور میں اقامت پذیر ہو گئے۔ نواب مظفر علی خان قزلباش مرحوم کا خاندان ان کا میزبان تھا خاص طور پر نواب محمد علیخان مرحوم قزلباش۔ علامہ ہروی مرحوم علوم متداولہ کا بحر ذخار تھے۔ لاہور کے اہل علم ان کے ارد گرد جمع رہتے تھے اور قرآن و سنت کے بعض مسائل و معاملات کے تعلق میں استفادہ کرتے رہتے تھے۔ حکیم شجاع الدین اور علامہ محمد اقبال مرحوم وغیرہ ایسے صاحبان علم و فضل بھی سرکار شیخ کے فیوض و برکات سے متمتع ہوتے رہتے تھے۔ نجی ملاقاتوں کے علاوہ علامہ اقبال سرکار شیخ علامہ ہروی کی تقریباً ہر تقریر میں پہنچنے اور سننے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

میں مقرر کی حیثیت سے جہاں بھی گیا پسند کیا گیا اور مسلم لیگ میں اس وقت کے بزرگوں اور نمایاں کارکنوں کی خاصی تعداد سے میرے تعلقات کم و بیش استوار ہوتے چلے گئے۔ نوابزادہ لیاقت علیخان۔ سردار عبدالرب نشتر۔ راجہ غضنفر علیخان۔ سید حسین شہید سہروردی۔ نواب محمد اسماعیل خان میرٹھ، نواب صدیق علیخان، راجہ محمد امیر احمد خان آف محمود آباد۔ راجہ سید محمد مہدی صاحب پیر پور، راجہ سید علی احمد صاحب سلیم پور۔ سید ذاکر علی صاحب آگرہ۔ راجہ سید اقبال مہدی نبشور مولانا شوکت علی خان صاحب

(مولانا محمد علی جوہر کے بڑے بھائی) نواب نوازش علی خان صاحب قزلباش راجہ اعزاز رسول سندیلہ چوہدری خلیق الزمان لکھنؤ، سید ظہیر الحسنین لاری گورکھپور، مولوی محمد اکرام عالم ایڈووکیٹ بدایوں، سید علی جان سرسی، کرنل سید عابد حسین جھنگ، میجر سید مبارک علی شاہ ضلع جھنگ، سید زوار حسین شاہ صاحب، رشش شاہ جیونہ ضلع جھنگ، قاضی محمد عیسٰی خان کوئٹہ، میر جعفر خان جمالی جیکب آباد، سیٹھ محمد اعظم صاحب کوئٹہ، ملک الرحمٰن صاحب کیانی کوہاٹ، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالقیوم کانپوری، سردار سید حسین شاہ رجوعہ سادات ضلع جھنگ، علامہ سید ابن حسن صاحب رضوی جارچوی، سید بشیر احمد رضوی ایڈووکیٹ اناؤ، سید کلب مصطفٰے ایڈووکیٹ رائے بریلی (ان دونوں کی رفاقت میں حسین بھائی لالجی کو لکھنؤ سے لے لیا اور بمبئی جانے پر مجبور کر دیا جبکہ وہ قائد اعظم مرحوم کے مقابلہ میں نامزدگی کرانے لکھنؤ کے شیعہ زعماء اور علماء کی تائید حاصل کر لے آئے تھے۔ سید علی ظہیر اور رضا خان برادر مولوی کلب عباس نے کانگریس کے اشارے پر بڑا زور لگایا۔ مگر ہم نے ان حضرات کو شکست فاش دی۔ سید معز حسین نقوی ایڈووکیٹ امروہوی کراچی۔ نوابزادہ ولایت علیخاں لاہور۔ سید اطہر یوسف ایڈووکیٹ حیدر آباد دکن، عزیزی سید احمد یوسف ایڈووکیٹ وزیر اطلاعات و صحت صوبہ سندھ و چیئرمین حیدر آباد میونسپل کارپوریشن کے والد ماجد، شیخ صادق حسن

امرتسر، شیخ مسعود صادق لاہور، سید علی کوثر لیاقت آباد کراچی، اللہ بخش چغتائی ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں، سید شاہ سید میاں پاراچنار، مولانا نجم الحسن کاروی پشاور، مولانا محمد بشیر انصاری ٹیکسلا راولپنڈی، صوفی عبدالحمید ربوہ جھنگ مولوی سید ابوطاہر ایڈووکیٹ، مولوی عزیز احمد خاں وکیل وغیرہ سے خاص راہ و رسم پیدا ہوگئی۔ میں نے ان میں سے کئی بزرگوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ مولانا شوکت علی مرحوم کے زیر ہدایت کئی انتخابات میں حصہ لیا۔ مولوی عزیز احمد خاں ایڈووکیٹ بریلی میری تقریریں سن کر مجھ سے اتنے مانوس ہوگئے کہ مجھے بریلی کے قیام پر مجبور کر دیا۔ مولوی عزیز احمد خاں انتخابی سیاست کے ماہر سمجھے جاتے تھے مرحوم سے میں نے انتخابی میدانوں کے پیچ وخم میں خاصا استفادہ کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح سے میرا کمانڈر اور سپاہی کا تعلق تھا قبل از تشکیل پاکستان میں نے اُن کو کئی بار نزدیک سے دیکھا مگر سلام کے علاوہ کوئی بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ سعادت اور عزت مجھے تشکیل پاکستان کے بعد ہی حاصل ہوئی اور میں نے قائداعظم محمد علی جناح سے کچھ امور پر گفتگو اور بعض مسائل کو سمجھنے کا شرف حاصل کیا علامہ شبیر احمد عثمانی جب بتوفیق الہٰی مسلم لیگ کی حمایت پر کمربستہ ہوئے تو اُن سے بھی میرے وسیع تعلقات قائم ہو گئے۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں کا تو میں عاشق تھا اور وہ مجھ پر غیر معمولی نوازش فرماتے تھے بہت سے

جلسوں میں دونوں بزرگوں کا ساتھ رہا۔ افسوس ہے کہ سب لوگ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ خان عبدالقیوم خان سے میرے تعلقات ۱۹۴۶ء سے شروع ہوئے اور ان کی وفات تک قائم رہے لیکن میں ان کی مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ ہو سکا کہ تقسیم جماعت کا عمل نہ مجھے کل پسند تھا اور نہ آج پسند ہے اس طرزِ کار سے جماعت کے وقار کو غیر معمولی دھچکا لگتا ہے جو لوگ بفضل خدا حیات ہیں ان میں سے مولانا جمال میاں فرنگی محل کراچی۔ محترم محمد یوسف خان خٹک بیرسٹر پشاور خواجہ محمد صفدر ایڈووکیٹ سیالکوٹ (فی الحال چیئرمین مجلس شوریٰ) سید مرید حسین شاہ صاحب سابق ایم این اے سیالکوٹ۔ سردار سید غلام عباس شاہ رجوعہ سادات ضلع جھنگ۔ مولانا محمد اسماعیل ذبیح صاحب کا تیموری کراچی۔ عبدالوحید خان صاحب سابق وزیر اطلاعات لاہور۔ مہاراجہ کمار محمد امیر حیدر خان محمود آباد لکھنؤ علامہ مرزا یوسف حسین لاہور۔ مولانا بادشاہ حسین پاراچنار۔ مولانا قاضی جواد حسین صاحب ہنگو۔ نواب نصراللہ خان بالیمین کرم۔ سید محمد حامد زیدی صاحب پشاور۔ سید حسن میاں ایڈووکیٹ خلفو گی بی سکھر۔ سید اخلاق الحسن زیدی انبالوی جھنگ۔ جنگسیانہ مہر محمد عارف رجبانہ ضلع جھنگ۔ مفتی محمد اطہر نعیمی کراچی وغیرہ خدا ان سب کو تادیر سلامت رکھے یہ سب تشکیل پاکستان کے سلسلہ میں میری خدمات سے کم وبیش

آگاہ ہیں۔ جنرل محمد موسیٰ خاں صاحب اگرچہ فوج میں ملازم تھے۔ تاہم میرا ان کا تعلق اور واسطہ ۱۹۳۲ء سے شروع ہوتا ہے اور بلوچستان کی حد تک مسلم لیگ اور تشکیل پاکستان سے متعلق میری خدمات سے آگاہی رکھتے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی سردار محمد اسحاق خان مرحوم تو جنگ تشکیل پاکستان کے بڑے پرجوش مجاہد تھے۔ طالب علمی کے دور اور سرکاری ملازمت میں ہونے کے باوجود تحریک پاکستان کو ہر رنگ میں آگے بڑھانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ بیرون بلوچستان سے آنے والے مسلم لیگی لیڈروں کی خصوصی ضیافت کا انتظام انہی کے والد سردار یزدان خان کے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ آج کل میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوتا ہوں کہ بہت سے کانگریسی اور اور مسلم لیگ کی مخالف دیگر جماعتوں کے ارکان اور ممبر جنگ تشکیل پاکستان کے مجاہد ظاہر کئے جا رہے ہیں اور تاریخ تشکیل پاکستان کو مسخ کرنے کی یہ کوشش مسلسل جاری ہے۔ بہتر ہوگا اگر میں یہ عرض کردوں کہ جماعت اسلامی، جمعیت علمائے ہند، انصار کانفرنس، مسلم مجلس احرار اسلام اور آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس لکھنؤ کے وابستگان میں سے کوئی شخص بھی قیام پاکستان کا حامی اور حمایتی نہیں تھا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ میں نے یا کسی بھی مسلم لیگ کے ممبر نے تحریک پاکستان میں شیعہ سنی۔ دیوبندی بریلوی، پنجابی، بنگالی یا اردو پشتو بولنے والے کی حیثیت سے حصہ نہیں

[illegible]

لیا تھا۔ ہم سب نے صرف اور صرف مسلمان کی حیثیت سے تشکیل پاکستان کی جنگ لڑی تھی اس سلسلہ میں علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم کے ارشادات عالیہ دہرانے کی عزت حاصل کر رہا ہوں :

خان بہادر سید محمود ذکی تعلقدار نے سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں مسلم لیگ کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے اس کی صدارت فرمائی تھی مفتی فخر الاسلام صاحب ایڈووکیٹ جون پور مولانا جمال میاں فرنگی محل۔ مولانا حسرت موہانی اور یہ ناچیز اس کانفرنس کے خصوصی مقرر تھے۔ اعظم گڑھ، جون پور۔ بنارس۔ غازی پور۔ بلیا۔ الہ آباد، فیض آباد پرتاب گڑھ۔ رائے بریلی وغیرہ کے مسلمان بڑی کثیر تعداد میں اس میں شریک ہوئے تھے کانفرنس کی کارروائی بڑے پرسکون ماحول میں جاری تھی مفتی فخر الاسلام کی تقریر ابھی ختم ہوئی تھی کہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے ایک عالم نے صدر کانفرنس علامہ شبیر احمد عثمانی سے سوال کرنے کی اجازت چاہی علامہ صاحب نے بڑی فراخدلی سے اجازت دے دی۔ مذکورہ بزرگ نے فرمایا کہ آپ کے قائد اعظم محمد علی جناح شیعہ ہیں اور ڈاڑھی منڈے بھی آپ ان کی قیادت کو کیسے تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ علامہ عثمانی نے نہایت نرمی سے جواب عطا کرتے ہوئے فرمایا۔ عزیزم قائد اعظم محمد علی جناح کو قوم نے نکاح اور نماز جنازہ پڑھانے کیلئے نہیں چنا ہے بلکہ قرآن وسنت کے مطابق آزادانہ زندگی گزارنے

کے لئے ایک مملکت کی تاسیس کے واسطے منتخب کیا ہے۔ قائد اعظم کی لیڈرشپ
شیعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمان کی حیثیت سے قبول کی گئی ہے اور
جتنے لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ شیعہ سنی۔ دیوبندی۔ فرنگی محلی کی حیثیت سے
اس تحریک میں شریک نہیں ہیں بلکہ مسلمان کی حیثیت سے شریک ہیں اور
ہم سب پہلے مسلمان ہیں۔ بعد میں سنی یا شیعہ ، بریلوی یا دیوبندی۔ جواب
کافی اور شافی تھا اور سائل نے اپنی تنی ہوئی گردن جھکالی تھی۔ اس مرحلہ
پر میں نے علامہ عثمانی سے درخواست کی کہ فاضل معترض کے جواب میں مجھے
بھی دو جملے کہنے کی اجازت دے دی جائے اور بعد از اجازت میں نے
عرض کیا حاضرین! سائل کا جواب تو مسکت ہو چکا ہے لیکن میں آپ کے
تفنن طبع کے لئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان بزرگوار سے یہ پوچھئے کہ
قائد اعظم محمد علی جناح کا تشیع تو آپ کو بڑا گراں گزر رہا ہے حالانکہ وہ مسلمان
کی حیثیت سے ہمارے لیڈر ہیں۔ تاہم مسٹر گاندھی۔ جواہر لال نہرو اور مسٹر راجندر
پرشاد وغیرہ کی سنیت کا آپ نے یقین تو حاصل کر لیا ہوگا۔ تبھی تو آپ ان
کی لیڈری دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں۔ اور آپ کو ان کی ڈاڑھی بھی نظر آگئی
ہوگی۔ واقعی آپ کی نظر ٹھیک ہی کام کر رہی ہے تاہم ڈاڑھی ان کے چہروں
پر تو نہیں سر پر چٹیا کی شکل میں نکلی ہوئی ہے میرے اس طرز خطاب پر جلسہ
زعفران زار بن گیا اور مجمع ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گیا اور میں اپنی کرسی

پر واپس جا بیٹھا۔ حضرت مولانا جمال میاں ﷾ اللہ ابھی حیات ہیں وہ اس واقعے کے شاہد عادل ہیں۔ خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان صرف مسلمان نے بنایا تھا۔ اگر ہم فرقوں کو اولیت دیتے تو پاکستان وجود میں نہیں آسکتا تھا پاکستان کے استحکام کے لئے بھی مسلمان کی حیثیت سے ہی ہمیں اپنی توانائیاں صرف کرنا ہوں گی۔ پاکستان میں فرقے نسل صوبے اور زبان کا مسئلہ کھڑا کرنے والے یا تو وہ لوگ ہیں جو خود اور ان کے خانوادے پاکستان کی تشکیل کے سخت مخالف تھے اور اب تک ان کے حلق کے نیچے پاکستان نہیں اترا ہے یا وہ حضرات ہیں جنہوں نے تشکیل پاکستان کی مساعی میں کوئی حصہ نہیں لیا اور اپنی اغراض فاسدہ کی تکمیل کے لئے صوبائی اور فرقہ وارانہ نعرے لگاتے رہتے ہیں۔ یہ طے شدہ ہے کہ نا اہل اور خود غرض لوگ قوم اور ملک گیر تحریکوں میں حصہ نہیں لے سکتے۔ ان میں صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ پوری قوم کو مخاطب کر سکیں اس لئے اپنی نا اہلی کو چھپانے کے لئے صوبہ پرستی یا فرقہ پرستی کی نقاب اوڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں اور آج کل تو فرقہ پرست اور صوبہ پرست اس حد تک دین و ایمان سے برگشتہ ہو چکے ہیں کہ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ وہ شیعہ یا سنی سندھی یا بلوچی پہلے ہیں۔ اور مسلمان بعد میں۔ ظاہر ہے کہ یہ فکر و عمل کفر محض ہونے کے علاوہ پاکستان کے حال اور مستقبل کے ساتھ ایک انتہائی مکروہ اور خطرناک مذاق بھی ہے

میرے نزدیک سیاسی جماعتوں کی کثرت بھی نااہلی کا شاخسانہ ہے۔ جو لوگ قومی مرتبہ کی قدآور شخصیتوں کے مقابلہ میں اپنی سیاسی کوتاہ قامتی محسوس کرتے ہیں تو فوراً ایک نئی جماعت بنا کر صدر اور سیکرٹری بن بیٹھتے ہیں اور قوم کو انتشار اور افتراق کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ خدا ہمیں ہر انتشار اور افتراق سے محفوظ رکھے۔ پاکستان کے جغرافیائی محل وقوع کے پیش نظر ہمارا فرض ہے کہ تشکیل پاکستان کے جذبے کو بیدار کریں اور صرف مسلمان کی حیثیت سے اپنے فکر و عمل کے قافلوں کو آگے بڑھائیں۔ تشکیل پاکستان سے بھی زیادہ استحکام پاکستان کے لئے ہمیں اتحاد اور اتفاق کی ضرورت ہے۔ مسلم لیگ ان مقاصد کی تکمیل کا بہترین اور آزمودہ ذریعہ اور وسیلہ ہے اور اس کی صدارت کے لئے محترم جناب سید سکندر علی شاہ صاحب پیر پگارہ مفید ترین اور موزوں ترین ہستی ہیں۔ وہ حالات کے لگائے ہوئے زخموں کو چاٹ چاٹ کے روتے نہیں بلکہ طنز و مزاح کے سہارے ان کی کسک اور چمک کو بے اثر کر دیتے ہیں۔

شبیہ الحسنین محمدی

۲۷ فروری ۱۹۸۳ء لاھور

تعارف

علامہ شبیہ الحسنین محمدی بدایونی کے معروف علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں یہ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ اور لدھیانہ میں فاضل ترین اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ اس خاندان میں حضرت محمد رحمۃ اللہ علیہ کے دور سے اس وقت تک سند ارباب علم و فضل پیدا ہوتے رہے ہیں آپ کے والد ماجد سند العلماء اعجاز الملت والدین علامہ محمد اعجاز حسن محمدی بدایونی مسلمہ عالم دین تھے احمد المدارس مدرسۃ الواعظین اور ناظمیہ عربی کالج دونوں میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے ان کے شاگردوں میں ہزارہا افراد آسمان شہرت کے آفتاب و مہتاب بنے

علامہ شبیہ الحسنین محمدی عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی میں درک رکھتے ہیں ایک مدت تک مشہور دینی آرگن البرہان کے اڈیٹر رہے تحریر و تقریر میں منفرد صلاحیتوں کے مالک ہیں عنفوان شباب سے دینی خدمات کے ساتھ ساتھ ملکی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے گراں قدر خدمات انجام دیں آپ کا رسالہ "پنڈت جواہر لال نہرو

کا مذہب "جو آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے اس کے مطالعہ سے جناب علامہ کے طرزِ تحریر اور سیاسی بصیرت کا واضح تعارف ہوتا ہے جناب علامہ کے فرزند مولانا نذر الحسنین حسن اعجاز محمدی مولانا فخر الحسنین حسین اعجاز محمدی دونوں عالم دین ہیں، میری دعا ہے کہ خداوند کریم اس خاندان کو مذہب و ملک کی خدمت کرنے کی توفیق مزید مرحمت فرمائے۔ آمین

علی غضنفر کراروی

وجہ تالیف

آج کل مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو رہا ہے۔ جو پنڈت جواہر لعل نہرو کو لا مذہب خیال کرتے ہوئے ان کی کورانہ تقلید کر رہا ہے۔ اور خود اپنے ہاتھوں چمن اسلام کو اجاڑ رہا ہے اور اگر کبھی اس جماعت کو اپنی غلط فہمی کا احساس ہوتا ہے تو تسکین قلب کے لئے یہ دلیل گھڑ لیجاتی ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو لا مذہب ہونے کی وجہ سے کسی مذہب سے محبت و ربط نہیں رکھتے اور اسی بنا پر تمام مذاہب پر اُن کا تبصرہ بے لاگ اور غیر جانبدارانہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اُن کی پیروی میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

یہ دلیل اصولی حیثیت سے جتنی لچر اور پوچ ہے اس سے بحث کی ضرورت نہیں، صرف اتنا گذارش کرنا ضروری ہے کہ اس دلیل کا سنگ بنیاد ہی غائب ہے یعنی پنڈت جی کی لا مذہبی کا شہرہ اور اس پر اعتقاد کم نظری اور کوتاہ بینی کا کرشمہ ہے۔ اس لئے کہ درحقیقت پنڈت جی لا مذہب نہیں ہیں بلکہ ہندو مت کے متوالے اور بہت بڑے مبلغ ہیں اور اس کے ساتھ اسلام

دشمنی اور مسلم کشی میں بھی کمال رکھتے ہیں اور موصوف کی یہ وہ ممتاز صفت ہے۔ جو ان کو تمام ہندو لیڈروں میں خاص درجہ دیتی ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ بنانے میں ید طولیٰ بھی رکھتے ہیں اور کوئی آسانی سے گرفت بھی نہیں کر سکتا۔ انہوں نے انتہائی دانائی سے کام لیکر اپنے اسلام کش طرز عمل پر وطنیت کی نقاب ڈال رکھی ہے۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس زریں نقاب کو تار تار کر دیا جائے اور حسن زیر حجاب کا جلوہ دکھایا جائے، اب وطنیت کا جال ان کی خود غرضانہ چالوں کو نہیں چھپا سکتا اور وہ خود اقراری ہیں کہ وطن پرستی کا ادعا فریب کاروں کی جائے پناہ ہے۔

"وطن پرستی اکثر ان لوگوں کی جائے پناہ ہوتی ہے جو موقع سے فائدہ اٹھانا یا اپنی حیثیت بنانا چاہتے ہیں، اور ہر مذاق اور غرض اور طبقے کے لوگوں کے لئے اس کی ایک مناسب قسم ملجاتی ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ کا وہ چیلہ جس نے انہیں دغا دی تھی۔ آج کل ہوتا تو وہ بھی وطن پرستی کی آڑ لیتا۔"

(میری کہانی صفحہ ۲۲۳ جلد دوم)

کیا پنڈت جی اپنے زیر نظر ارشاد کی حدود سے باہر ہیں؟ کیا وہ وطن پرستی کے ہنگامے میں مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک نہیں کر رہے ہیں جو حضرت عیسیٰ کے چیلے کا طرۂ امتیاز تھا؟ وہ مسلمان جو پنڈت جی کو لامذہب

سمجھ کر اپنے پیروں پر کلہاڑی چلا رہے ہیں اور انھیں ممدوح کے افکار کی روشنی میں عارف راز وطن پرستی ہونا چاہیئے۔ ہم نے بھی پیش نگاہ اوراق میں ایسے ہی خوش فہم مسلمانوں کی ہدایت اور بصیرت افروزی کا سامان مہیا کیا ہے اور یہی اس رسالہ کی تالیف کی علت غائی ہے کہ بھٹکے ہوئے مسلمان راہ راست پر آجائیں۔ کسی کی نیت پر حملہ یا کسی کی دل آزاری ہمارا مقصود نہیں ہے۔ ؎

من انچہ خیر و صوابست با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

شبیر الحسنین بدایونی بقلمہ

تصویر کا پہلا رُخ

تمہید مدعا مشاہدہ سے ثابت ہے کہ بسا اوقات مشہور و معروف افراد کے متعلق بعض ایسی بے سروپا باتیں شہرت پا جاتی ہیں، جن کا حقیقت میں وجود تو کیا نام و نشان تک نہیں ہوتا اور وہ اپنے افسانہ ہونے کے باوجود عوام و خواص کے دل و دماغ پر اتنی قوت اور شدت کے ساتھ اپنی واقعیت کا رنگ جما جاتی ہیں کہ ایک مدت تک اصل حقیقت کے ظاہر ہونے پر بھی مسحور نگاہیں غلط و صحیح کے امتیاز سے قاصر رہتی ہیں۔ عقلِ جوہرِ بین کی بصیرت افروزیاں تفس سہل انکار کی ظاہر پرستیوں کے مقابلہ میں متاع کاسد قرار پاتی ہیں اور انسان جو اپنے اشرف مخلوقات ہونے پر نازاں ہے، بزم حیوانیت میں سکون و اطمینان کی لہریں محسوس کرنے لگتا ہے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں ماضی بعید کے صحیفہ کی ورق گردانی کی حاجت نہیں۔ کتاب حال میں ہی بہت کچھ زمانہ کی باطل فروشیوں کے کرشمے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر پنڈت موتی لال نہرو کے کپڑوں کا افسانہ

ہی لے لیجئے ایک زمانہ تک اچھے خاصے سنجیدہ لوگ بھی یہی سمجھتے تھے کہ پنڈت جی کے کپڑے پیرس میں دھلا کرتے ہیں، غریب ہندوستان کو ان ششت وشو کا فخر حاصل نہیں ہوتا۔ اس انوکھے افسانے کو بطور واقعہ اتنی عمومی شہرت حاصل ہوئی کہ پنڈت جواہرلال نہرو کو مجبوراً اپنی سوانح عمری میں اس کی اصلیت پر روشنی ڈالنا پڑی اور موصوف کو لکھنا پڑا کہ یہ محض خوش عقیدہ لوگوں کی من گھڑت کہانی ہے ورنہ اس کی اصل کچھ بھی نہیں ہے۔ بلکہ صرف حضرت خیال کی کرشمہ سازی ہے لیکن کورانہ عقیدت مندی اور شہرت پرستی کا بھلا ہو کہ اب بھی اکثر تعلیم یافتہ اور بالبصیرت افراد ایسے نظر آجاتے ہیں جو خوش فہمی کا شکار اور سابقہ اعتقادات کی دلبستگیوں میں مست بلکہ دوسروں کو بھی یہ افسانہ ایسے بعینہٖ سناتے ہیں گویا آنکھوں دیکھی بات بیان کر رہے ہیں۔

جذبات عقیدت کی خلاقی کے اس نمونے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب صاحبان عقل وشعور بعیداز قیاس اور قطعاً بے بنیاد باتوں کو گل سرسبد معلومات قرار دیکر دین وایمان کا مرتبہ دے دیتے ہیں۔ تو وہ خیالی افسانے جن کو ذرا بھی عقل وفہم سے لگاؤ ہو کتنی کچھ شہرت پا سکتے ہیں

مسٹر گاندھی کی وطن پرستی اور ملک دوستی کا زریں پردہ قریب قریب

بالکل تار تار اور اس کا پس منظر فرقہ پرستی کی ہولناک سازشوں سمیت بے نقاب ہو چکا ہے مگر بہت سے ذی فہم حضرات جن کو قوم کی رہبری کا مرتبہ بھی حاصل ہے۔ ابھی یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ گاندھی جی بہت بڑے دیش بھگت ہیں اور ان کو کسی فرقے کے مخصوص مفاد کے لئے ان تھک سعی سے کوئی واسطہ نہیں وہ صرف ملک کے ہی خواہ ہیں اور ان کا ہر قدم وطنی مفاد کے لئے ہی بڑھتا ہے۔ حالانکہ بہت سے واقعات ایسے رونما ہو چکے ہیں جو گاندھی جی کی فرقہ نواز ذہنیت کے آئینہ معقول اور اہل عقل کے لئے سرمایہ بصیرت ہو سکتے ہیں۔ اچھوت ادھار ہندی پرچار اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں فضا کی ظلمت آفرینی کا شکوہ وغیرہ ایسے امور نہیں ہیں جن کو آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے لیکن وطنیت کا خوش آئینہ حجاب خدید سے شدید فرقہ پرستی کے ظہور پر بھی چاک ہونے میں نہیں آتا۔ ہند جدید کے دانا مدبر نے اپنی دلفریب مسلسل تدبیروں سے قوت ادراک و احساس کو مفلوج کر رکھا ہے کوئی بصیرت کے ساتھ قول و عمل کے فرق کا مطالعہ کرنے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا ورنہ اگر عقل سے کام لیا جائے۔ تو حقیقت کا منصۂ شہود پر جلوہ نما ہو جانا کچھ مشکل نہیں ہے اور جن لوگوں نے شمع فہم و شعور کی روشنی میں گاندھی جی کے حرکات و سکنات کے باطنی رخ کو جانچا ہے وہ رازِ دوعملی سے آگاہ ہو کر دام

غلط فہمی سے رہائی حاصل کر چکے ہیں۔ غرضکہ دنیا میں ہزاروں افسانے بطور واقعہ مشہور ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور مناسب وقت آجانے پر بصیرت والوں کے ہاتھوں ان کا اصل رنگ اور روپ نمایاں ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

زمانہ کی افسانہ پسندی کا ایک کرشمہ پنڈت جواہر لال جی کی لامذہبیت کا شہرہ بھی ہے۔ ہر چہار طرف یہی شور مچا ہوا ہے اور ایک عامی سے لے کر اہل علم تک کا یہی خیال ہے کہ پنڈت جی کا کوئی مذہب نہیں اور نہ کسی مذہب کے کسی نظری یا عملی پہلو سے کوئی دلچسپی۔ بلکہ آپ کا مطمع نظر اور مقصد حیات صرف یہ ہے کہ مذہب کی عمارت کو خواہ وہ کسی رنگ ڈھنگ کی ہو مسمار کر دیا جائے اور اس سے بھی بڑھکر اگر ہو سکے تو ان لوگوں کو نیست و نابود کر دیا جائے جو مذہبی رجحانات رکھتے ہیں لطف یہ ہے کہ شہرہ لامذہبیت کی عمارت کو تا فلک پہونچانے میں خود پنڈت جواہر لال بھی پیش پیش نظر آتے ہیں کیونکہ موصوف کبھی اپنی مذہبی تخئیل کے بارے میں کوئی صاف و صریح بات نہیں کہتے بلکہ ہندوستانی شاعروں کے خیالی معشوق کی زلفوں کی طرح گو مگو کا ایک پُر پیچ و خم لفظی طلسم تیار کر دیتے ہیں جس سے عوام تو کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ عوام کے بھی پلے کچھ نہیں پڑتا اس پر اہل نظر کی سہل نگاری اور عدم تدبر سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے اور

آخر کار کانوں کی فضا اس آواز سے معمور ہو جاتی ہے کہ پنڈت جی لامذہب ہیں۔ حالانکہ حقیقت امر یہ ہے کہ پنڈت جی اچھے خاصے مذہبی آدمی ہیں مگر ذرا مدبر قسم کے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر وہ اپنے مذہب کو معمہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ لامذہب مشہور ہو کر ہندوستان میں بسنے والی مختلف الاعتقاد قوموں کا اعتماد حاصل کر کے ان کو آہستہ آہستہ اس راستہ پر لے آئیں جو ان کا پسندیدہ راستہ ہے اسی لئے پنڈت جی اپنے مذہب کے متعلق جب کچھ کہتے ہیں تو لفظوں کا گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیتے ہیں جن کا ظاہر کچھ اور کہتا ہے اور باطن کچھ اور ہاں اگر غور و فکر سے کام لے کر پنڈت جی کے بیانات پر نظر ڈالی جائے اور ان کے کوائف حیات پر کامل عبور حاصل کر لیا جائے تو پنڈت جی کا مذہب بے نقاب سامنے آسکتا ہے اور ان کی تہ بہ تہ پردوں میں چھپی ہوئی ذہنیت آشکارا ہو سکتی ہے

اگر پنڈت صاحب کو کسی مذہب کا پرستار ثابت کرنے کے لئے اپنی طرف سے کچھ دلائل مرتب کئے جائیں تو یہ ایک فضول اور بے معنی سی بات ہوگی۔ لیکن اگر خود پنڈت صاحب اپنی زبان سے اپنے مذہبی رجحانات کا تذکرہ کر دیں تو کسی کو شک و ریب کا موقع نہ رہے گا۔ اور خود پنڈت صاحب کے لئے بھی انکار و تاویل کی گنجائش نہ ہوگی اسی بنا پر ہم راشٹرپتی جی کے عروس مذہب کے رخ زیبا سے نقاب اٹھانے کے لئے انہیں کے بیانات

سے مدد لیں گے - خاص طور سے مرصوف کی خود نوشت سوانح عمری میری کہانی کو بطور گواہ پیش کریں گے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ معمولی بیانات کے متعلق یہ عذر کر دیا جائے کہ وہ ارتجالاً لکھے گئے تھے وہ جذبات وتصورات کے حقیقی آئینہ دار نہیں ہو سکتے لیکن سرگذشت کے متعلق یہ عذر نہیں کیا جا سکتا ہے اور پنڈت صاحب بھی یہی فرماتے ہیں کہ وہ اپنی سوانح عمری میں جذبات و خیالات سمیت بے نقاب نظر آتے ہیں بلکہ انہوں نے کوشش کر کے اپنے رجحانات کو سرگذشت کے صفحات میں نمایاں کیا ہے۔

اس سرگذشت کے لکھنے میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر واقعہ کے ساتھ ان خیالات اور جذبات کا بھی ذکر کر دوں جو اس وقت میرے دل میں تھے تاکہ جہاں تک ممکن ہو میری اندرونی حالت کا اندازہ ہو جائے۔ میری کہانی ص ۳۳ جلد ۲

اس حقیقت کے دریافت ہو جانے کے بعد کہ میری کہانی پنڈت جی کی اندرونی حالت اور باطنی کیفیت کا مرقع اور قلب ودماغ کی گہرائیوں میں پرورش پانے والے جذبات وخیالات کا چربہ ہے۔ ہم یہی مناسب خیال کرتے ہیں کہ پنڈت جی کے مذہبی رجحان کو معلوم کرنے کے لئے دوسرے بیانات سے تمسک نہ کرنا پڑے۔ بلکہ میری کہانی ہی کے دامن سے اتنا سامان نقاب کشائی مہیا کر دیا جائے جو اہل بصیرت کی تسلی وتشفی کے لئے کافی ووافی ہو سکے۔

عقلا کے نزدیک پیکر حقیقت میں ایک طاقت ہوتی ہے۔ ظہور کے لیے مضطرب ایک قوت ہوتی ہے نمود کے واسطے بیتاب اس کے تابناک چہرے کو جبر و قہر کے پردے زیادہ عرصہ تک نہیں چھپا سکتے۔ موافق ہوا کا معمولی سے معمولی جھونکا بھی فولادی بندشوں کے ٹکڑے اڑا دیتا ہے۔ اور حقیقت کا چراغ عالم افروز ہو جاتا ہے۔ پنڈت جواہر لال خود یا ان کے پیرو لا مذہبیت کے کتنے ہی اونچے راگ کیوں نہ الاپیں لیکن مذہب پرستی کی حقیقت ثابتہ نغمہ ساز دل کے غیر مرئی پردوں سے نکل کر میری کہانی کے اوراق میں شکن ہے اور بابصیرت ناظر اس کی دعوت نظارہ پر لبیک کہہ کر اقرار کرنے پر مجبور ہے کہ پنڈت جی ہرگز لا مذہب نہیں ہو سکتے بلکہ وہ مذہب کے پرستار ہیں۔ اس مذہب کے جو ان کو آبا و اجداد سے بطور ورثہ ملا ہے اور وہ اس کے اتنے ہی چاہنے والے ہیں۔ جتنے کہ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ اگر ان دونوں میں کوئی فرق کیا جا سکتا ہے تو بس اتنا کہ ان میں سے ایک صاحب نہرو ہیں اور ایک مالویہ طریق کار میں بھی تھوڑا سا تفاوت پایا جاتا ہے منزل دونوں کی ایک ہے راستے کچھ مختلف ہیں ایک منظر عام پر کھلم کھلا غیر ہندوؤں پر دست و بازو کی قوت آزما رہا ہے اور دوسرا گلے مل کر خنجر آزمائی کا فرض پورا کر رہا ہے مرہٹہ قوم کے فرزند روزگار سپوت سیواجی کی دو مختلف صفتوں کے دونوں مظہر ہیں۔ ایک اصلی لباس میں رہ کر اسلامی فوج پر شبخون مارنے کی فکر میں محو ہے اور دوسرا ہاتھ میں شیر پنجہ چھپائے

افضل خاں کے ہم مشربوں کے گلے میں باہیں ڈال کر محبت و مودت بھری باتوں کے بہانے قلب و جگر کو رشکِ گریبان بنانے کی سعی میں غرق اور اگر مسلمان کی نظریں اب بھی وطنیت کے جال میں پھنسی رہیں اور آغوشِ قلب میں پرورش پانے والے ارادوں تک نہ پہونچیں تو وہ دن دور نہیں کہ انقلابِ روزگار کے ہاتھوں وہی حسرت خیز منظر پیش نظر ہو جائے جو افضل خاں کی دشمن اعتمادی کے نتیجے میں سامان حیرت مہیا کر چکا ہے۔ ہمارا یہ بیان بعض افراد کے استعجاب کا باعث ضرور ہوگا۔ اور وہ یہ کہنے میں باک نہ کریں گے کہ پنڈت جی کو اتنا کٹر ہندو سمجھنا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا لیکن ہم آئندہ سطور میں اپنے دعویٰ کا دلائل قاہرہ اور براہین نیرہ سے ثبوت پیش کریں گے۔

استیصال انسان جس مذہب کا پیرو اور دلدادہ ہوتا ہے وہ اس مذہب کے لوازمات ضروریات اور مظاہر سے ارادی یا غیر ارادی طور پر دلچسپی اور وابستگی کا اظہار کرتا رہتا ہے اور اس اظہار کی صورتیں ایک حد تک حسب ذیل ہوتی ہیں

اس مذہب کے بانیوں اور مبلغوں سے عقیدت رکھتا ہے اور ان کی تعریف کرتا ہے ان کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے جن پر اس مذہب کی بنیاد ہے۔ ان عبادتوں کو مستحسن خیال کرتا ہے جو اس مذہب نے رائج کی ہوں اس زبان سے الفت رکھتا ہے۔ جس میں اس کے مذہب کی کتابیں اپنے اصلی روپ میں ہوتی ہیں۔ اس زمانے کے تصور سے زندگی حاصل کرتا ہے جس

میں یہ مذہب ظہور پذیر ہوا یا منزل عروج تک پہنچا - اس تہذیب اور تمدن کو سراہتا ہے جو اس کے پسندیدہ مذہب کی تعلیم کا نتیجہ خیال کیا جاتا ہے۔ ان چیزوں کے عظمت و وقار کا نغمہ الاپتا ہے جو اس کے مذہب نے محترم قرار دی ہیں- ان تیوہاروں اور مظاہروں کے وجود کو کسی نہ کسی رنگ میں ضروری خیال کرتا ہے۔ جو سال کے مختلف حصّوں میں مذہب کی طرف سے مقرر کئے گئے ہوں۔ منزل خیال میں ایک ایسے شخص کو لے لیجئے جو در حقیقت ہندو مت کا دلدادہ اور پابند ہے اگرچہ وہ اپنے آپ کو لفظی طور پر ہندو نہ کہتا ہو اس کے اعمال و افعال، حرکات وسکنات کا جائزہ لیجئے اور ظاہر و باطن کو ایک ساتھ سامنے رکھیئے تو اس کے حالات خود بول اٹھیں گے کہ وہ ویدوں کی تعلیم کا پرستار ہے۔ مبلغان وید کی عزت کرتا ہے - دیگر مذہبی کتابوں بھاگوت گیتا وغیرہ کا مطالعہ کرتا ہے پر ارتھنا اور پرستش کا کسی نہ کسی انداز میں خوگر ہے۔ سنسکرت اور ہندی کو سب زبانوں سے بہتر اور ان کی توسیع ضروری خیال کرتا ہے۔ پراچین تہذیب اور قبل مہا بھارت ایام کو سراہتا ہے اور موجودہ دور میں اس کی حیات ثانوی کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ گائے وغیرہ جانوروں کی حرمت کرتا ہے رام لیلا وغیرہ مذہبی یادگاروں کو رواج دینے کی سعی کرتا ہے جو شخص اور مذکورہ سے

دلچسپی رکھتا ہو۔ اور اظہار عقیدت کرتا ہو وہ ہندو ہونے سے چاہے کتنا ہی انکار کرے۔ ہندو تسلیم کیا جائے گا اور اس کا انکار قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ آیئے اِن روشن چراغوں کے اجالے میں پنڈت جواہر لال جی کا مذہب معلوم کرلیں لیکن اس وادی میں پہنچنے سے پہلے ہندو مت کی تعریف سے آشنا ہونا بھی ضروری ہے اس لئے کہ کسی منزل تک کسی راستہ پر گامزن ہوئے بغیر رسائی ناممکن ہے۔

ہندو مت کی تعریف

درحقیقت ہندو مت نام ہے چند رنگ برنگے متضاد اعتقادات اور کچھ متنوع رسوم کا نہ اس کی مقررہ حدود ہیں نہ اس کے پاس کوئی معین نظام معاشرت ہے اور نہ کوئی تہذیب و تمدن۔ اسی بنا پر اس کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جاسکتی خود ہندو بھی اس سعی میں آج تک ناکام ہیں ایک پرمیشور کا دشمن مطلق دہریہ ایک نیم دہریہ (آریہ) اور ایک اول درجے کا بت پرست یہ سب اپنے متضاد جذبات، اعتقادات اور خیالات کے باوجود ہندو مت کے دائرہ میں رہتے ہیں جو مورتی پوجا کا کھنڈن کرنے والے ہیں (دیانندی گروہ) وہ بھی ہندو کہلاتے ہیں اور جو بت پرستی کا منڈن کرتے ہیں (مالویہ جی کی جماعت) وہ بھی ہندو سمجھے جاتے ہیں۔ جو لوگ سر پر چٹیا رکھنا فرض خیال کرتے ہیں وہ بھی ہندو اور جو اس بار

کہ غیر ضروری جانتے ہیں وہ بھی ہندو ہیں غرضیکہ اعتقادات، جذبات، احساسات، تہذیب اور معاشرت میں ظاہری ہم آہنگی کی بھی ضرورت نہیں ہے بس ایک دو رسموں کا پورا کرلینا اور آدھے پونے عقیدے کو قبول کرلینا ہندو برادری میں شامل رکھنے کے لئے کافی ہے یہی وجہ ہے کہ زمانے کا انقلاب ہند و تہذیب تمدن تخیل اور تصور میں جتنے چاہے تغیر پیدا کرے مگر ہندوازم کا کچھ نہیں بگڑتا۔ جس طرح موم ہر سانچے کے مطابق شکل بدلتا رہتا ہے لیکن رہتا ہے موم کا موم موجودہ دور کا سائنس بدوش انقلاب بھی ہندومت میں اپنے اثرات سے تغیرات کے مختلف نقشے پیدا کر رہا ہے مگر اس ہنگامے سے ہندو تہذیب و معاشرت کا کچھ بھی نہیں بگڑ رہا ہے اس لئے کہ اس کے اصول غیر متعین اور ہوا کے رخ بدل جانے والے ہیں، اشتراکیت و اشتمالیت اپنا رنگ جما رہی ہیں لیکن ہندوؤں کی پیشانیوں پر شکن بھی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ان کے پاس تعین تھا کب جو وہ تغیر سے پریشان ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ ہندومت حقیقی اور منظم مذہب نہیں کہا جاسکتا۔ پنڈت جواہر لال جی نے بھی ہندومت کی تعریف میں حقائق مذکورہ کا اقرار کیا ہے

ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر

صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو، جیسے کہ قدیم فلسفی چارو ک تھے، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں ہندومت اِن کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں۔ چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی ہوں۔ میری کہانی صہ۳۰۲، ۲۰۳ جلد ا۔

پنڈت جی نے ہندومت کی منصفانہ تصویر کشی میں قابل داد انداز سے اپنے مذہبی تخیل کو بھی آشکارا کر دیا ہے ڈاکٹر محمد عالم صاحب لاہوری کے مقدمے کے سلسلے میں حلف نامے کی عبارت میں سے پرمیشور کا نام خارج کرنے پر جو اصرار کیا تھا وہ انکار مذہب نہ تھا بلکہ چاروک فلسفے کی تقلید اور اس کا احیا مدنظر تھا اور پنڈت جی کھلم کھلا پرمیشور کے انکار کے بعد بھی ہندو ہیں۔ جس طرح قدیم فلسفی چاروک ہندو تھے۔ لیکن پنڈت جی نے اپنی ہندومت سے وابستگی کے اقرار صریح کے ساتھ ہی انکاری انداز بھی پیدا کر دیا ہے اور چند لفظوں کو تضاد پسندی کا مظہر بنا کر انکار و اقرار مذہب کا گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ آخری جملہ اس مقصد کے پیش نظر

لکھا گیا ہے کہ ناظر پنڈت صاحب کے مذہبی رجحان کے متعلق غلط فہمی میں گرفتار ہو جائے اور خیال کرنے لگے کہ پنڈت جی کو ہندومت سے کوئی واسطہ تو ہے نہیں لیکن چونکہ یہ مت ہے ہی ایک معجون مرکب اس لئے زبردستی دامن سے لپٹا ہوا ہے اور سعی رہائی کو سعی لاحاصل بنا دیتا ہے مگر بمصداق "ثما فنظر نباشد" یہ یاد رکھنا کہ ہندومت کی آہنی گرفت کا جو قصیدہ ارشاد فرما چکے ہیں اس کے آبدار اشعار خود بدولت کی مدح میں بھی موزوں ہوتے ہیں۔ پنڈت جی ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ بقول خود یہی بات ان کو ہندو ثابت کرنے کے لیے کیا کم ہے۔ مزید براں وہ اس کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کوئی کوشش بھی نہیں کرتے اور برابر قدیم رنگ اختیار کئے ہوئے ہیں۔

تشریح مزید لبریز پیمانے سے وہی چیز چھلکتی ہے جو اس میں ہوتی ہے یہ ممکن نہیں ہے کہ ساغر میں ہو تو شراب اور زمین پر آتے آتے پانی ہو جائے بالکل اسی طرح انسان کے دل میں جو خیال اور تصور ہوتا ہے۔ لفظوں کی صورت اختیار کر ہی لیتا ہے اور سوچ سمجھ کر بات کرنے والے بھی غیر شعوری طور پر خطرات ضمیر کو ظاہر کر ڈالتے ہیں۔ نفاق کی پردہ پوشیاں آغوش قلب میں کروٹیں بدلنے والے تخیلات کو اہل بصیرت کی نگاہوں سے پنہاں رکھنے میں

ناکام ہو جاتی ہیں۔

پنڈت صاحب ہندو ہیں اور ہندو ہونے کا غیر ارادی طور پر اقرار بھی کرتے ہیں لیکن چونکہ لامذہبیت کی شہرت سے کچھ کام نکالنا چاہتے ہیں اس لئے اقرار و انکار کو ملتبس کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ حسب ضرورت تاویل میں آسانی حاصل رہے مگر دل کی بات لبوں تک آئے بغیر نہیں رہتی ہندو مت سے محبت کے جذبات چھپائے نہیں چھپتے سابقہ بیان میں جو یہ فقرہ چلا تھا کہ میں تو بس پیدائشی برہمن ہوں، برہمن ازم سے مجھے کیا دلچسپی۔ اس کا مقصد خلط مبحث ہی ہے لیکن زیر نظر ارشاد پر وہ التباس کو چاک کئے دے رہا ہے کہ پنڈت جی محض پیدائشی برہمن ہی نہیں ہیں بلکہ آپ کے جذبات احساسات تصورات اور تخیلات سب برہمن روایات سے وابستہ ہیں اور آپ عمل اعتبار سے بھی برہمن ہیں اور یہ شہرہ بے حقیقت ہے کہ لامذہب ہیں۔

"غالباً میرے خیالات اور تصورحیات میں مغربی رنگ مشرقی رنگ پر غالب ہے مگر اور ہندوستانیوں کی طرح میں بھی اپنے دیس سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہوں اور میرے نفس کے نیم شعوری طبقے میں برہمنوں کی سینکڑوں پشتوں کی روایات دبی ہوئی ہیں نہ تو میں قدیم اثرات سے آزاد ہو سکتا

ہوں نہ جدید خیالات سے یہ دونوں میری سیرت کا جزو
بن گئے ہیں۔ میری کہانی صـ۳۴ـ جلد دوم"

مطلب اس کا یہ ہوا کہ پنڈت جی کی فضائے نفس پر برہمن روایات اس حد تک چھائی ہوئی ہیں کہ ظاہر کو مغربی سانچے میں ڈھالنے کی سعی کے باوجود ان کا اثر نمایاں ہو ہی جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم چولے میں جدید حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے کچھ کتر بیونت کر لی گئی ہے چیز وہی ہے جو مہابھارت اور اس سے بھی پہلے کے بازار میں ملتی تھی البتہ صورت شکل پر غازۂ مغرب کی میناکاری کا رنگین عمل ہو گیا ہے یعنی پنڈت جی صرف پیدائشی برہمن یا برہمن خانوادے کے چشم و چراغ ہی نہیں ہیں۔ بلکہ برہمن اعتقادات و تصورات کی کمند میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ تجربہ کار سائنس کی معجزانہ کد و کاوش بھی رہائی دلانے میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی اور دو رنگی سیرت کو یک رنگ نہیں بنا سکتی۔

فریب جمیل جو لوگ پنڈت جی کی سیرت اور ذہنیت کا نظر بصیرت سے مطالعہ نہیں کرتے اور ظاہری زیبائش کی جاذبیت پر خطوط بصری نثار کر کے اپنے آپ کو حقیقت آشنا سمجھتے ہیں ان لوگوں کو غلط فہمی کا شکار بنانے کے لئے حسب عادت مذکورہ بیان میں تصور حیات پر مغربی رنگ کے غلبے کا ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ معرفت خواہ نگاہیں برہمن ذہنیت کا مریکی

مشاہدہ کرنے کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں اور پھر یہ خیال قوت پکڑ جائے کہ پنڈت جی مغربی دیوی کے پرستاروں میں ہیں لیکن خود پنڈت جی کی زبانی یہ انکشاف کتنا عجیب اور کتنا حیرت خیز ہوگا کہ وہ مغربی رنگ جو تعمیر خیالات و جذبات میں غالب ہے اپنی حقیقت کے اعتبار سے برہمن ازم ہے ہاں تعبیر اس کو لفظ مغرب سے کیا گیا ہے۔ اصلیت میں ظاہر و باطن کی تشکیل برہمن روایات سے ہی ہوئی ہے اور رنگ مغرب میں بھی چمک دمک برہمن گلال ہی کی ہے۔

فانوس کے پردے میں وہ آپ ہی پنہاں تھا
پروانہ کے سینہ سے پھر خود ہی نمایاں تھا

حقیقت ایک ہے مظاہر مختلف۔

عجیب انکشاف پنڈت جی اور ان کے رفقاء کار کی طرف سے برابر یہ شہرت دی جارہی ہے کہ راشٹرپتی جی کی ذہنیت کی تشکیل و تعمیر اشتراکی خیالات سے ہوئی ہے اور آپ کی زندگی کا مقصد وحید ہندوستان میں اشتراکیت کی تبلیغ ہوگیا ہے۔ میری کہانی کے اکثر اوراق بھی اشتراکی معمولات کی تشریح سے معمور نظر آتے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ اتنی کثرت اور شدت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ پوجیہ پنڈت کی اشتراکیت نوازی آفتاب نیمروز کی طرح برہان و دلیل کی احتیاج سے بالاتر ہے اور ہر کس و ناکس غور و فکر

کی زحمت سے بے نیاز ہو کر آپ کو اشتراکی نظریہ حیات کا علمبردار سمجھتا ہے۔ گو ایک حد تک یہ درست ہے کہ طول و عرض ہند میں اسٹالن اور لینن وغیرہ کا کوئی جانشین اس شان و شوکت کا موجود نہیں ہے دوسرے اشتراکیت نواز زیادہ تر موصوف ہی کے مقلد ہیں اور جن دو چار نے اصل مرکز سے اس حیوانیت بداماں تعلیم کو حاصل کیا ہے۔ وہ اس جرأت اور دلیری کے ساتھ اس کی تلقین نہیں کر سکتے مگر کس قدر استعجاب آفرین ہے یہ انکشاف کہ پنڈت جی کی اشتراکیت کے متعلق شورا شوری اس بنیاد پر نہیں ہے کہ فی نفسہ اشتراکی تعلیم انسانیت کے لئے مفید ہے اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اس میں ایسے اصول وضع کئے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنی مایوسانہ زندگی کو کشمکش حیات کی تنگ و تاریک راہوں سے بسلامتی گذر کر معمور مسرت بنا سکیں بلکہ پنڈت جی بزم اشتراکیت میں اس لئے سکون و اطمینان کی سانسیں لے رہے ہیں کہ اس کی با مکر و فریب آرائشوں کے آغوش میں نفس کے نیم شعوری طبقے میں دبے ہوئے برہمن احساسات کی آبیاری اور تربیت کا سامان ملتا ہے اور روسی نظام حیات میں وہی کچھ غذا دستیاب ہوتی ہے جو برہمن دسترخوان کی زیب و زینت ہے۔

پرانی تہذیب بہت سے سخت طوفانوں سے بسلامت گذر گئی
لیکن اگرچہ اس کی ظاہری صورت قائم رہی اس میں باطنی حقیقت

باقی نہیں رہی۔ آج کل وہ خاموشی کے ساتھ مگر جی توڑ کر ایک نئے اور نہایت طاقتور حریف کا مقابلہ کر رہی ہے۔ یعنی مغربی سرمایہ داری کی بنیوں والی تہذیب سے اس نئے حریف سے وہ شکست کھا جائے گی کیونکہ مغرب اپنے ساتھ سائنس لایا ہے اور سائنس سے لاکھوں فاقہ کشوں کو روٹی ملنے کی امید ہے لیکن قاتلانہ تہذیب کے زہر کا تریاق بھی مغرب اپنے ساتھ لایا اور وہ اشتراکیت ہے یعنی اتحاد عمل اور عام مفاد کی خاطر جماعت کی خدمت کرنے کا اصول برہمنوں کا جو پرانا خدمت کا نصب العین تھا اس سے یہ کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے میری کہانی صفحہ ۲۶۰ جلد ۲

معلوم ہوئی آپ کو مغربی رنگ کی حقیقت ظاہر ہے کہ وہ اشتراکیت ہے اور پنڈت جی کے نزدیک برہمن ازم اور اشتراکیت میں کوئی خاص فرق نہیں مفہوم واحد ہے نام جداگانہ ہونے سے کیا بگڑتا ہے اس لئے جس رنگ کو مغربی رنگ سے تعبیر کیا گیا ہے وہ بھی دراصل برہمن رنگ ہے یعنی گلگونہ مغرب کی نظر افروزیوں کی تہ میں بھی برہمن خط و خال کی نمود ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ پنڈت جی نہ تو صرف پیدائشی برہمن ہیں اور نہ آپ کے خیالات میں مغربیت کی نمود بلکہ آپ کلیتہً ہر حیثیت میں ہر رنگ میں برہمن تصور حیات کے پرستار ہیں۔

تفصیل افادات پنڈت جی کے تضاد پناہ لفظوں کا طلسم مسطورہ نگارش میں بھی بھول بھلیوں کا منظر پیش کر رہا ہے۔ مگر ہندوانہ ذہنیت کی عریانی کا ضرورت سے زیادہ سامان موجود ہے اس لئے ہم ان افادات کی تفصیل کئے دیتے ہیں جو بیان سابق کی جان ہیں۔

(۱)

ابتدائے بیان میں پراچین تہذیب کی جرأت آموز تاب متاومت کا تذکرہ کر کے اپنے ہم مشربوں کی ہمت افزائی کا سامان کیا ہے کہ تمہاری تہذیب کی کشتی تو اتنی قوی اور استوار ہے کہ عربی، تاتاری، ایرانی اور افغانی یعنی اسلامی طوفان کی ہلاکت آفرینیوں سے نہ صرف اپنے وجود کو بچالے گئی بلکہ ظاہری صورت و شکل کو بھی محفوظ رکھا۔ جب توانائی کا یہ عالم ہے تو آئندہ بھی ہر انقلاب سے مقابلہ کر سکتی ہے اور دور ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ہر طرح محفوظ رہے گی۔

(۲)

اس ہمت افزائی کے ساتھ یہ تہدید بھی ہے کہ گو پراچین تہذیب اسلامی تمدن سے نبرد آزما ہو کر کامیابی حاصل کر چکی ہے مگر مغربی حملہ آوری کی زد سے اس کا بچنا دشوار نظر آ رہا ہے کیونکہ جدید محارب کے ہاتھ میں سائنس کی تیز تلوار ہے اس لئے تم کو چاق و چوبند رہنا چاہیئے۔

(۳)

تمہید کے بعد پست ہمت کو ابھارنے کے واسطے یہ مژدہ اور بشارت بھی سنادی گئی ہے کہ گھبراؤ نہیں۔ پراچین تہذیب کی رعنائیاں مغرب کے مٹائے مٹ نہیں سکتیں بلکہ خاموش مقابلہ کرکے نئے حریف کو نیچا ہی دکھائیگی اور مرض مغرب کا علاج اشتراکیت کی دوا کے نام سے پرانے نظریہ حیات برہمن ازم کے ذریعہ ہو جائے گا۔ اور آخر کار جس طرح اسلامی تہذیب سے ٹکرانے کے بعد پراچین اصول وقوانین کے ہاتھ میدان رہا مغرب سے جنگ کا نتیجہ بھی برہمن ازم کی فتح ہوگی اور دنیائے ہند میں بشان سابق پراچین تہذیب کا جھنڈا لہرائے گا اور برہمن ازم قائم ودائم۔

(۴)

غیر محسوس مگر موثر انداز میں مسلمانوں کو یہ لطیف مشورہ دیا ہے کہ تمہاری تہذیب اور تمدن میں تو اتنا دم بھی نہ تھا کہ ہمارے پیڑا نے دھڑے میں ذرا بھی انقلاب پیدا کر سکتے تو مغرب کے سیلاب کا کیونکر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا آؤ پراچین تہذیب کے دامن میں پناہ لو جو مغرب کے فولادی پنجے کو بھی موم بنائے دے رہی ہے۔

(۵)

برہمن ازم کے مفہوم سے وحشیوں کو مانوس بنانے کے لئے اشتراکیت

کا لفظ اختیار کیا گیا ہے تاکہ غیر ہندوؤں کو اس تمائلی لفظ کے سہارے بآسانی برہمن ازم کے جال میں پھانس لیا جائے اور کسی کو لب شکایت ہلانے کا موقع بھی نہ مل سکے اور اگر کسی طرف سے سوال ہو بھی جائے تو سادگی کے ساتھ جواب دیدیا جائے کہ آپ کو دعوت تو دی گئی تھی بزم اشتراکیت میں شرکت کے لئے مگر اتحاد حقیقت کیوجہ سے آپ آگئے برہمن ماحول میں تو آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اصلاً تو دونوں ایک ہی ہیں آپ اشتراکیت کو تو مفید انسانیت تسلیم کر ہی چکے ہیں برہمن نظریۂ حیات کو بھی قبول کر لیجئے کیونکہ ان دونوں میں صرف لفظی فرق ہے معنی میں کوئی تفاوت نہیں اور صاحبان عقل لفظی اختلاف کے جھگڑوں میں نہیں پڑا کرتے۔ بس ہو جائیے۔ برہمن ازم کے آستانے پر سجدہ ریز اور بن جائیے پکے اشتراکی۔

یہ ہیں وہ افادات عالیہ یا مہلک زہر کے شیریں گھونٹ جو حسین الفاظ کے پیمانوں میں نذر ارباب ذوق کئے گئے ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کا مطلب کیا ہے صرف یہی ناکہ نفس کے نیم شعوری طبقے میں بیتاب رونمائی برہمن جذبات کو آسانی سے محسوس نہ کیا جا سکے۔

پراچین تہذیب کی حیات ثانیہ کے منصوبے ہر چند و پراچین تہذیب

کا والہ و شیفتہ ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہی زمانہ اس کے قومی اور مذہبی عروج کا زمانہ تھا پنڈت جی بھی ایک ہندو ہیں اور عام ہندوؤں کی طرح پراچین تہذیب کی حیات جدید کا رنگین خواب دیکھا کرتے ہیں مگر کیفیت قلب کے اظہار کا انداز ذرا الگ ہے نغمہ تو وہی ہے جو مہا سبھائی ساز سے بلند ہوتا رہتا ہے لیکن لَے دوسری اختیار کر لیگئی ہے۔ مذکورہ بیان بھی اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ پنڈت جی اپنے ہم قوموں کے دوش بدوش پراچین تہذیب کے کرم خوردہ قالب میں روح حیات کی لہریں دیکھنے کے لئے مضطرب ہیں اسی لئے تو پانچ ہزار برس سے بھی پہلے پراچین تہذیب کی چتا کے خشتر ہو جانے والے ذروں کی حیرت خیز توانائی کا ذکر کیا گیا ہے متعدد طوفانوں سے سلامتی کا افسانہ بیان ہوا ہے یہ نہ خیال کر لیجئے گا کہ ہم خواہ مخواہ پنڈت جی کی نیت پر حملہ کرنے کے لئے مبہم جملوں کی آڑ لے رہے ہیں بلکہ ہمارے پاس پنڈت جی کے اس تخیل کا روشن ثبوت موجود ہے۔

ممکن ہے کہ جب ہندوستان نیا لباس پہنے اور وہ تو پہننا ہی ہے اس لئے کہ پرانا پھٹ کر چیتھڑے چیتھڑے ہو گیا ہے تو اس کی تراش ایسی ہو کہ موجودہ حالات اور پرانی وضع دونوں کے ساتھ نبھ سکے جو رنگ اختیار کرے وہ ایسا ہونا چاہئے کہ قدیم رنگ میں

کھپ جائے۔ میری کہانی ص۲۰ جلد ۲

مجھے آپ جنگ آزادی کے جرنیل کا مطلب ؟ چاہتے ہیں کہ اگر پرانی تہذیب میں ذرا بھی تغیر نہ ہوتا اور وہ مہابھارت سے پہلی والی شکل میں ہی زندہ ہو جاتی تو اچھا تھا مگر چونکہ آفتاب سائنس کی بصیرت افروزیوں کے خوف سے کچھ نہ کچھ جوڑ پیوند لگانا ہی پڑیں گے اس لیے مناسب حال ترمیم کر لی جائے اور رنگ ایسا اختیار کیا جائے جو پراچین رنگ میں کھپ جائے۔

پنڈت جی کی پراچین تہذیب سے والہانہ الفت کا مزید ثبوت

حسن اتفاق سمجھئے یا توارث

صفات کا کرشمہ کہ باپ بیٹے پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال پراچین تہذیب نے دوسرے جنم کو قریب تر لانے کے لئے ایک سیاسی طریق کار اختیار کرتے نظر آتے ہیں

جس زمانے میں پنڈت موتی لال نہرو نے مغربی دیوتا کی آستانہ بوسی ترک کر کے سوراجی دیوی کے چرنوں میں سر رکھا تو بظاہر یہ محسوس کیا گیا کہ چونکہ پنڈت جی جدید تعلیم سے باقاعدہ آراستہ ہیں اس لئے آپ کے ذہنی اور قلبی رجحانات بھی جدید سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں گے اور خود موصوف نے بھی یہی ظاہر کیا کہ مجھے ہندو یا مسلم تہذیب کی بقا اور فنا کے سوال سے کوئی

دلچسپی نہیں ہے میں تو صرف ہندوستان کی آزادی کا خواستگار ہوں چنانچہ راشٹر پتی جی اپنے والد بزرگوار کے ان خیالات کو جو اس وقت ان کی زبان پر آیا کرتے تھے حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

موثر عمل کی انہیں کوئی صورت نظر نہ آتی تھی سودیشی اور بائیکاٹ سے کچھ کام چلتا معلوم نہیں ہوتا تھا اور پھر ان تحریکوں کی تہ میں مذہبی رنگ کی قومیت تھی جو ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کے حامی نہ تھے نہ وہ اسے سمجھ سکتے تھے میری کہانی صفحہ جلد اوّل۔

لیکن جب حصول سوراج کی کوششوں میں کچھ دم آیا اور پنڈت موتی لال نے یہ محسوس کر لیا کہ اب ہندو قوم میں تھوڑی بہت بیداری پیدا ہو چکی ہے اور پراچین تصورات میں فی الجملہ قوت آ چکی ہے تو نفس کے غیر مرئی گوشوں میں چھپے ہوئے برہمن احساسات ظہور کے لئے بیتاب ہونے لگے اور آخر کار نہرو

نوٹ: اس سلسلہ میں اتنی بات اور ذہن نشین کر لیجئے کہ سعی سوراج کی ابتدا ہی سے اکثریت کے دلوں میں پراچین تہذیب کو زندہ کرنے کا تخیل پرورش پا رہا تھا اور اسی تخیل کے جوش میں ان کے قدم آگے بڑھ رہے تھے حتی کہ سودیشی اور بائیکاٹ کے پردے میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔

رپورٹ کے صفحات پر وہ نقوش ابھر آئے جو زمانہ سازی کی پالیسی کے ماتحت قلب مرتعش میں داب داب کے رکھے گئے تھے اور جو شخص کبھی پراچین تہذیب کو سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے ہندوستان کے لئے وہ نظام عمل ترتیب دیا جس کے نتیجے میں پراچین تہذیب کی نمائش کے سوا ارض ہند میں کچھ نہ ہوتا۔

پنڈت جواہر لال بھی آزادی سے ابتدائی ڈلپیوں کے ایام میں آزاد خیالی کے پیکر نظر آتے ہیں ادھر کسی نے پرانی تہذیب کا نام لیا اور جبین مبارک پر بل پڑ گئے مگر جیسے ہی کانگرس کے بازوؤں میں قوت کا احساس ہوا اور دستوری انقلاب کے سہارے سفید فام بنیوں کے ہاتھوں کی طاقت گندم گوں بنیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگی تو حریت خیال کا وہ سائنٹفک پردہ جو اقتضائے ماحول کے پیش نظر ترتیب دیا گیا تھا تار تار ہو کر رہ گیا اور پورے زور پر بھی پراچین تہذیب کے حسن بے پایاں کا انعکاس ہونے لگا اور اس کو از سر نو لباس حیات پہنانے کی تمنا لفظی جامہ زیب تن کرنے لگی۔ پراچین تہذیب کے روحانی محاسن اور اس کے تن بدن میں، دوسری تہذیبوں سے تاب مقابلہ کی فراوانی وغیرہ کا تذکرہ کیا جانے لگا۔

افلاس و ذلت کے باوجود ہندوستان شرافت و عظمت سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ وہ قدیم روایات اور موجودہ مصیبتوں

کے بوجھ سے دبا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کا خمار تھا مگر اسی کے ساتھ اس میں ایک حسن تھا جو روحانی کیفیت نے اس کے خط و خال میں پیدا کر دیا تھا اس کے عجیب و غریب تصورات نادر تخیلات اور پاکیزہ جذبات کے نقوش ایک ایک کر کے اس کے چہرے پر اُبھر آئے تھے اس کے شکستہ چہرے سے روحانی عظمت و وقار کی جھلک اب تک نظر آتی تھی اس نے تاریخ کی طویل منزلیں طے کی ہیں اور اس سفر میں علم و حکمت کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے اسے بہت سے اجنبیوں سے سابقہ پڑا اس نے سب کو اپنے وسیع خاندان میں شامل کر لیا۔ اس نے بڑے نشیب و فراز اٹھائے۔ سختت ذلتیں اور مصیبتیں جھیلیں اور عجیب عجیب تماشے دیکھے لیکن اس لمبے سفر میں اول سے آخر تک اس نے اپنی پرانی تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا اس سے تقویت اور زندگی حاصل کی اور دوسرے ملکوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا۔ جھولے کی طرح وہ کبھی اوپر گیا کبھی نیچے آیا۔ اٹھا تو اپنے تخیل کی پرواز سے آسمانوں کی خبر لایا اور گرا تو پستی کے گڑھے میں پاتال تک پہونچا۔ باوجود باطل اوہام اور لغو رسوم کے بوجھ کے جس نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ اس

روح افزا تعلیم کو بالکل بھولا نہیں تھا جو ابتدا میں اس کے

دانا ترین اور روشن ضمیر حکیموں نے اپنشد کے زریعے دی تھی

میری کہانی صفحہ ۲۵۵ جلد ۲۔

اس بیان میں پراچین تہذیب سے جس والہانہ عقیدت کا مختلف طریقوں سے اظہار کیا گیا ہے وہ کسی تبصرے کی محتاج نہیں ہے بس لطیف اہتمام کے ساتھ پراچین تہذیب کے پرستاروں کے دل و دماغ پر یہ نقش کندہ کیا گیا ہے کہ تمہاری تہذیب گوناگوں انقلابات کے باوجود صحیح و سالم ہی نہیں رہی بلکہ اسنے اپنے وسیع دامن میں غیروں اور اجنبیوں کو بھی پناہ دی اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں کو بھی اپنا شیدا بنا لیا ذرا ہمیت سے کام لیتے رہو مستقبل میں بھی یہی تہذیب زندہ رہیگی۔

رام راج کا رنگین خواب اس درس و تلقین کے ساتھ پنڈت جی اپنی رام راج پسند ذہنیت کو عریاں کر رہے ہیں۔ مگر رام راج کا لفظ استعمال کرنے میں مصلحت نہیں سمجھتے اور جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے یہ پنڈت جی کا خاص انداز ہے کہ وہ لفظ سے قطع نظر کر کے معنویت کی تبلیغ کرتے ہیں اور یہ طریقہ ہے بھی زیادہ موثر اور مفید کیونکہ جب آہستہ آہستہ اذہان میں نقش معنی مرتسم ہو جائے گا تو لفظ خود بخود شان مقبولیت حاصل کر کے لبوں تک رسائی حاصل کرے گا۔

اس معاملہ میں پنڈت جی اتنے محتاط واقع ہوئے ہیں کہ اگر ان کے بجائے ہندؤں کی اصلی کیفیت جذبات کے تلاطم سے مجبور ہو کر انھیں لفظوں میں ظاہر کر دیتے ہیں جو رام راجی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وضع ہوئے ہیں تو پنڈت جی بگڑ کھڑے ہوتے ہیں اور ٹوکتے ہیں کہ ظالموں یہ کیا کر رہے ہو اگر جال اپنے رنگ میں نظر آ گیا تو سارے بھولے بھالے طائر اڑ جائیں گے

ہندو بھی ویدوں کے عہد اور راماین۔ اور مہا بھارت
کے زمانہ کی دھن میں رہتے ہیں اور رام راج کا خواب دیکھا کرتے ہیں
میری کہانی صفحہ ۱۳۱ جلد ۲

جوش تنبیہ میں یہ فرماتے ہیں کہ میری قوم میں رام راج کا خواب دیکھا تو ضرور جاتا ہے اور اس کی جلد از جلد تعبیر کی دھن بھی لگی رہتی ہے مگر میں ان تخیلات سے بلند ہوں۔ میں ایسا خواب نہیں دیکھا کرتا لیکن کوئی پوچھے کہ جب آپ کے نفس کے نیم شعوری طبقے میں برہمی روایتیں دبی ہوئی ہیں اور وہ بھی سیکڑوں پشتوں کی اور جب آپ خلعت اشتراکیت اس لئے زیب جسم فرماتے ہیں کہ آپ کے نزدیک اس کی تراش خراش برہمی اصول کے مطابق ہوئی ہے اور پھر آپ اس قوم کی ایک فرد بھی ہیں جو رام راج کی فکر میں گھلی جاتی ہے تو آپ اپنے قومی اور نسلی رجحانات سے الگ کیونکر رہ سکتے ہیں فطری طور پر آپ کے وہی احساسات اور جذبات ہونا چاہئیں جو آپ کے

ہم جنسوں کے لئے طرۂ فخر و مباہات ہیں۔

رام راج کا مفہوم بحث کو طول سے بچانے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رام راج کا مفہوم معلوم کر لیا جائے آخر یہ ہے کیا چیز؟ پنڈت صاحب نے عام ہندوؤں کی طرف نسبت دیکر اس کے اجزائے وجود پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے اور دیگر ذرائع سے یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ موجودہ زمانے میں وہی ماحول پیدا کر دیا جائے جو مہابھارت، رامائن اور ویدوں کے دور میں پایا جاتا تھا یعنی اگر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ خود اس کے ہاتھوں میں آجائے تو یہاں نظام سلطنت ان اصولوں کی روشنی میں ترتیب دیا جائے جو رام جی وغیرہ کے دور حکومت میں رائج تھے اور راج سبھا کے ارکان وہی منتخب کئے جائیں جن کے دل و دماغ کی پیشانیاں ویدک فلاسفی سے معمور ہوں۔ حدود عدل و انصاف کا انداز بھی وہی ہو۔ تہذیب تمدن اور معاشرت کے قوانین پرانے سانچے میں ڈھالے جائیں۔ غرضکہ ہر شئے اور کام میں وہی رنگ بھر دیا جائے جو ویدک ایام کے نقش و نگار میں تھا اس ماحول کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس طرح قبل مہابھارت طول و عرض ہند میں صرف ہندو قوم آباد تھی۔ آج کل بھی ایک ہی قوم آباد ہو۔ متحدہ قومیت کی بنیاد اسی لئے رکھی گئی ہے کہ آہستہ آہستہ اقلیتوں کو اکثریت میں جذب کر لیا جائے اور رام راج کے خواب کی

روشن تعبیر حاصل کر لیجائے ملاحظہ کیا آپ نے رام راج کے مفہوم کو اب بتلایئے کہ راشٹرپتی جی اور عام ہندوؤں کے تخیلات میں کیا فرق کیا جاسکتا ہے عقل سلیم تو سوائے لفظوں کے اور کوئی تفاوت محسوس نہیں کرتی چونکہ عام ہندو اتنا دماغ نہیں رکھتے کہ رام راج کے مفہوم کو غیروں کے سامنے ایسے الفاظ میں پیش کر دیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اس لئے ان کے دل کا چور آسانی سے گرفتار ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار کہہ دیتے ہیں کہ ہم ویدک ماحول کو از سر نو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پنڈت جی اس چالاک شکاری کی طرح جو اپنے شکار کی طبیعت اور عادت سے واقف ہے اسی مفہوم کو دوسرے لفظوں میں بیان کر کے بطریق احسن کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پنڈت جی کے بیان اور عام ہندوؤں کے تخیل کا موازنہ کر کے دونوں کے ماحصل کو ملائیے تو حقیقت کی یکرنگی کا راز بالکل آشکار ہو جائے گا۔

ایک سنگھٹنی مہاشے کے الفاظ میں پنڈت جی کے بیان کی تعبیر

گذارش کیا جا چکا ہے کہ پنڈت جی لینا تو چاہتے ہیں رام راج ہی کی دنیا میں مگر ارادہ یہ ہے کہ غیر ہندوؤں کو بھی لفظوں کے پھندوں میں پھانس کر ساتھ ہی آباد کر لیں یہ عبرتناک حقیقت اس وقت بالکل بلا کم و نقاب ہو جاتی ہے جب سنگھٹنی مہاشے سوامی ستیہ دیو اور راشٹرپتی

جی کے تصورات مختلف لباسوں میں متحد نظر آتے ہیں۔

ہندو سنگٹھن اس لئے کیا جارہا ہے کہ اس دیش کی پراچین تہذیب کے مالک ہندو ہیں لوگ کہتے ہیں کہ کیا مسلمان ہندوستان سے نکل جائیں میں اس کو نہیں مانتا ہوں گنگا کی دھار میں گندگی وغیرہ کی ندیاں ملجائیں گی۔ لیکن مکھ دھارا گنگا جی کی رہے گی۔ اسی طرح مکھ ہندو تہذیب ہی رہے گی۔

اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ ملاحظہ کیجئے۔

جب ہندو سنگٹھن ہو جائے گا تب مسلمان ترکی اور افغانستان کا خیال چھوڑکر ہندو سنگٹھن کے جھنڈے کے نیچے آجائیں گے مکھ دہارا شری گنگا جی کی ہے اس میں جمنا اور سرجو وغیرہ ندیاں آکر گرتی ہیں۔ گرنے کے بعد ان کا نام نہیں رہتا بلکہ نام صرف گنگا جی ہی کا رہتا ہے اسی طرح مکھ قوم ہندوؤں کی ہے جس میں سب دوسرے فرقے مل جائیں گے۔ روزنامہ تیج دہلی ۲۴ مئی ۱۹۳۶ء

سوامی ستیہ دیو کا بیان پنڈت جی کے ارشاد کی اتنی واضح تفسیر ہے کہ بغیر کسی تبصرے کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ پنڈت جی رام راجی تصورات میں کس قدر ڈوبے ہوئے ہیں۔

پنڈت جی کی رام راج نوازی پر ایک اور دلیل

یہ حقیقت ناقابل

انکار شواہد سے ثابت ہے کہ رام راج کا تصور تمام ہندوؤں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے حتیٰ کہ بڑے سے بڑا وطن پرستی کا مدعی بھی اسی خیال میں مگن نظر آتا ہے اور کوئی روشن خیال ہندو باوجود تلاش ایسا نہ ملا جو رام راج کو زندہ دیکھنے کا آرزو مند نہ ہو کسی اور کا تو ذکر کیا ہے کانگرس کے مہا صدر مسٹر گاندھی بھی اپنے ادعائے وطن پرستی و قوم نوازی کے باوجود رام راجی فضا میں براجمان ہونے کے لئے مضطرب نظر آتے ہیں۔

گاندھی جی اس تدریں زمانے کو جو لوٹ آنے والا تھا اکثر رام راج کے نام سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ میری کہانی ص۱۲۹ جلد اول۔

اب بتایئے جب گاندھی جی ایسا مشہور و معروف آزاد خیال بھی رام راج کی دقیانوسی دنیا میں آباد ہونا چاہتا ہو تو پھر کون اس لطیف تخیل سے بے بہرہ باور کیا جا سکتا ہے اور چونکہ راشٹرپتی جی کو گاندھی جی کے عقیدتمندوں میں پہلا درجہ حاصل ہے اس لئے وہ بھی رام راج کے بندوبست میں ہر طرح مشغول رہنا ہی زندگی کا مقصد حقیقی سمجھتے ہیں اور گاندھی جی کی آڑ میکر بالواسطہ وہی سماں دیکھنا چاہتے ہیں جو گرو جی کی آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔

گاندھی جی کی نیازمندی میں پنڈت جی کو جو مرتبہ حاصل ہے اس کا اندازہ حسب ذیل بیان سے ہو سکے گا۔

رہے گاندھی جی تو ان کا سمجھنا بہت ہی مشکل تھا کبھی کبھی ان کی گفتگو اس قسم کی ہوتی تھی کہ عام طور پر جدید خیالات کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن یہ ہمیں یقین تھا کہ وہ بہت بڑے اور بے مثل انسان اور عظیم الشان رہنما ہیں اس لئے ہم ان پر ایمان لے آئے اور انہیں سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا۔ میری کہانی صفحہ ۱۲۹ جلد اول۔

پنڈت جواہر لال ایسے آزاد خیال مدبر کی طرف سے گاندھی جی کے عقل و فہم سے بالاتر ہوتے پر ایمان لانے کی دعوت عام کے حجاب لطیف میں رام راج تخیل کی کارفرمائی بدرجہ اتم نمایاں ہے اور کورانہ تقلید کے جذبہ شدید سے ہویدا ہے کہ رام راج کی خوش آئند تمنائیں پنڈت جی کے دل و دماغ کی فضا پر بھی چھائی ہوئی ہیں اگرچہ وہ بہ نظر احتیاط لفظ رام راج زبان پر لانے کی کوشش نہیں کرتے مگر لفظی کمی سے اصل مقصد کی تکمیل پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس نقص کو بھی دنیائے ہند کے سیاہ و سپید کا مالک بہت بڑا بے مثل انسان عظیم الشان رہنما عقل اور اس کی بلند پروازوں کی دسترس سے باہر وجود دور کر رہا ہے اور وہ اپنی دوربین آنکھوں سے سوراج یا پورن سوراج کے دامن میں رام راج کے طفل شیر خوار کو کروٹیں بدلتے دیکھ رہا ہے۔ مستقبل قریب یا بعید

میں شبابی کیفیت پیدا ہو ہی جائیگی اس لئے کہ سوراج پرستوں کی اکثریت رام راجی ماحول ہی کے لئے سرگرم عمل ہے اور طرز عمل اس کا معتبر گواہ

پنڈت جی کی ایک خطرناک پالیسی

پنڈت جی نے مسٹر گاندھی سے والہانہ بلکہ کورانہ عقیدت وتقلید کے اظہار میں اس کثرت سے طول طویل نثری قصیدے ارشاد فرمائے ہیں کہ اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو بجائے خود ایک خاصی ضخیم کتاب مرتب ہو جائے گی میری کہانی کا شاید کوئی بدنصیب باب ایسا ہو جس میں گاندھی جی کو مافوق الفطرت شخصیت کا انسان ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش نہ کی گئی ہو اور اسی جدوجہد کی بوقلمونی ایک بابصیرت کو راز درون پردہ معلوم کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے اس لئے کہ جو شخص خدائے کائنات کا نام تک بھی اپنی زبان پر لانا خلاف شان خود پرستی سمجھتا ہو وہ آخر کس لئے ایک خطاکار ہستی کو سیاہ سپید کا مالک. قوت ادراک کی دسترس سے باہر عقل کی رسائی سے ارفع نقد ونظر سے بالا اور اندھا دھند اتباع کے لائق باور کر رہا ہے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی عقل وفہم کی بصیرت افروزیوں سے الگ رہنے کی ہدایت کر رہا ہے۔

درحقیقت یہ صد درجہ خطرناک پالیسی ہے اور اس کے اثرات غیر ہندو قوموں کے لئے انتہائی تباہ کن زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

اس رنگین فریب کے پس منظر کو مختصر لفظوں میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی اکثریت کے سامنے ایک ایسا نظام حکومت ہے جو ویدوں کی تعلیمات سے ماخوذ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب اس شان و شوکت کا نظام و قانون منظر عام پر لایا جائیگا تو اہل عقل کے اعتراضات کی بارش اس کو ایک منٹ کے لئے بھی قابل قبول نہ چھوڑے گی اور رام راج کا خواب محروم تعبیر رہ جائیگا اس لئے ضرورت ہے کہ ایسے لچر اور پوچ نظام کو مرغوب اور محبوب بنانے کے لئے ایسے ہاتھوں کی استعمال کیا جائے جن کو پہلے سے خطا اور غلطی وغیرہ انسانی کمزوریوں سے محفوظ باور کرا دیا جائے اور عوام کے دل و دماغ کو اتنا مرعوب کر دیا جائے کہ وہ رائج کرنے والے کی عظمت و رفعت کو دیکھتے ہوئے مروجہ نظام کے نقائص و معائب پر نظر ہی نہ ڈال سکیں اور اگر کبھی شک و شبہ پیدا ہو ہی جائے تو اس خیال سے سامان تسکین قلب فراہم کرلیں کہ اگر اس میں کسی قسم کی خامی ہوتی تو پھر گاندھی جی ایسا مافوق الفطرت تدبر کا مالک انسان اس کو رائج ہی کیوں کرتا لہٰذا اس کے معائب ہی محاسن کے لباس میں نظر آئیں گے اور رام راج کے رواج میں شمع عقل کی روشنی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتی

ناظرین یہ نہ خیال فرمائیں کہ ہم خود بھی خیالی دنیا کی سیر کر رہے ہیں اور دوسروں کو بھی توہم پرستی پر آمادہ کر رہے ہیں اس لئے کہ مشاہدہ گواہ

ہے کہ پنڈت اینڈ کو کی یہ پالیسی کافی موثر ثابت ہو رہی ہے گاندھی جی جو کچھ بھی ارشاد فرما دیتے ہیں اس کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیا جاتا ہے۔ خود تو کیجیے، جب جنگ آزادی کا ہیرو کہدے کہ گاندھی ہر رنگ اتباع کے لایق ہیں۔ خواہ ان کے افعال و اقوال سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں تو پھر کون ہے جو بصیرت و بصارت سے کام لیکر زیر پردہ مقاصد کو دیکھ سکے، یہی وہ پالیسی ہے جس نے ڈاکٹر محمود ڈاکٹر اشرف مولوی حسین احمد وغیرہ سینکڑوں ہزاروں، ذی فہم و ذی علم افراد کو اسلامیات سے بیگانہ بنا کر سوراج بھون کا معتکف بنا دیا اور اب وہ اپنی تمام طاقتوں کو شجرۂ اسلامی کی بیخ کنی میں صرف کرنا قابل فخر فریضہ سمجھ رہے ہیں۔

پنڈت جی اور گائے پرستی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہندوستان کے دائرے میں رنگا رنگ اور بوقلموں تضاد خیال و عمل پایا جاتا ہے مگر بایں ہمہ گائے کے معاملے میں ہندوؤں کے تمام فرقے اور طبقے آج کل تقریباً یکرنگ نظر آتے ہیں اور سب کسی نہ کسی عقیدت کے ساتھ گائے کو ایک محترم اور باعظمت جانور خیال کرتے ہیں اور اس کے ذبیح ہونے کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اگرچہ پراچین تہذیب کے دور حیات میں (جس کو موجودہ زمانے میں زندہ کرنا ہر ہندو فرض خیال کرتا ہے) گائے کو محترم جانور ہونے کے اعتبار سے کوئی خاص حیثیت حاصل نہ تھی اور اس کو ذبیح کر کے اس کا

لذیذ گوشت مزے لیکر کھایا جاتا تھا۔

قدیم آریوں کے یہاں گائے کا گوشت کھانے کی شہادت پائی جاتی ہے لیکن دودھ دینے والی گائیں شاذ و نادر ہی ماری جاتی تھیں۔ رگوید انڈیا ص ۹۷

لیکن جدت نوازی کے جذبے نے پراچین تہذیب کے دامن میں گئو رکھشا کا پیوند لگا دیا ہے اور تضاد آفرینی کا مظاہرہ کرنے کے لئے سابقہ نظریہ میں ترمیم کر لی گئی ہے تاکہ ایک جانور کی آڑ لیکر مسلمانوں کا خاطرخواہ صفایا کیا جا سکے اور حیوانیت پر انسانیت کو نثار کر دیا جائے۔

اس ایجاد لطیف کا فخر آریہ تاریخ کی روشنی میں سب سے پہلے سوامی دیانند جی کو حاصل ہوا۔

گئو رکھشا پر سب سے پہلے لیکچر رشی دیانند نے ہی دیے تھے اور آج جو گئوشالائیں نظر آتی ہیں۔ یہ سب انہی آواز کا نتیجہ ہیں

اخبار پرکاش لاہور ۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۰ء

سوامی دیانند سے پہلے گئو رکھشا کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ اسلامی عہد حکومت میں عام طور پر گائے کی قربانی ہوتی تھی مگر تاریخ کے اوراق میں کسی ایسے ہندو مسلم فساد کا پتہ نہیں چلتا جو گائے کی قربانی کی وجہ سے پیدا ہوا ہو اور اس کا سبب یہی ہے کہ گائے کو اس زمانے تک کوئی مذہبی

اہمیت حاصل نہ تھی۔ یہ تخیل تو اس وقت پیدا ہوا جب سوراج حاصل کرنے کے لئے گاندھی کا خیال دل و دماغ پر مسلط ہوا اور یہ محسوس کیا گیا کہ مسلم اقلیت کو مزید اقلیت میں تبدیل کئے بغیر رام راج کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

بہرصورت آج کل تمام ہندو فرقے گئو رکھشا کے حامی بنے ہوئے ہیں اور یہ جذبہ اتنی شدت حاصل کر چکا ہے کہ بسا اوقات ایک گائے کی حفاظت و حمایت کے نام سے ہزاروں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہوئے بھی باک نہیں کرتے۔

یہ امر کچھ تعجب انگیز نہیں ہے کہ راشٹرپتی جی بھی ہندو دھرم کے شیدائی کی حیثیت سے گائے کی الفت و محبت میں کسی دوسرے ہندو سے پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ موصوف گئو رکھشا کی وادی میں اپنے رفقاء سے دو چار قدم آگے ہی نظر آ رہے ہیں۔ مگر اس میں کسی کو زبان اعتراض کھولنے کا کیا حق اس لئے کہ پنڈت جی کا دیانتدی جذبہ اسی گرم سیری کا مقتضی ہے اور موجودہ دور کا ہندو ہونے کی حیثیت سے ان کا یہی فریضہ ہے کہ وہ گائے کی محبت کا جس طرح چاہیں مظاہرہ کریں۔

ہم ہندوستانی جانوروں کو پیار سے نہیں پالتے اور عجیب بات یہ ہے کہ اہنسا کے عام فلسفے کے باوجود ان سے اکثر لاپروائی

بلکہ سختی کا سلوک کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے ہی کو لے لیجئے۔ ہندوؤں کو یہ جانور کس قدر محبوب ہے وہ اس کی دیکھ بھال کیا پرستش تک کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے لئے بلوے تک ہو جاتے ہیں باایں ہمہ گائے سے کچھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا جاتا میری کہانی صفحہ ۱۳۳ جلد دوم۔

پنڈت جی اپنے مخصوص انداز بیان میں درس دے رہے ہیں کہ گائے کی عظمت کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اس کی پرستش کر لی جائے یا حفاظت کے بہانے سے گاہے ماہے فساد کی بنیاد ڈالی جائے بلکہ اہنسا کے عام فلسفہ کی روشنی میں اس بات کی ضرورت ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے اس کی ہر اعتبار سے کامل حفاظت کی جائے اور قربانی وغیرہ کے سلسلے میں اس کے ساتھ جو بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے اس کو روکا جائے۔ اور ہر رنگ اچھے سلوک کی مثال قائم کی جائے۔

راشٹرپتی جی اپنی ارشادات پر بس نہیں کرتے بلکہ کچھ آگے بڑھ کر عام ہندوؤں کے گائے سے متعلق جذبات کو اچھی طرح برانگیختہ کرنے کے لئے ایک انوکھی مگر حد درجہ خطرناک ترکیب نکالتے ہیں اور یوں ارشاد فرماتے ہیں

> مختلف ممالک نے مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے مقاصد یا اپنی سیرت کے اظہار کے لئے علامت کے طور پر اختیار کر رکھا ہے مثلاً

ریاستہائے متحدہ اور جرمنی نے عقاب انگلستان نے شیر اور بل ڈاگ اور فرانس نے لڑتا ہوا مرغا قدیم روس کا نشان ریچھ تھا۔ کیا جانوروں کو قومی نشان بنانے سے قوموں کی سیرت پر کچھ اثر پڑتا ہے؟ ان میں سے اکثر لڑنے والے جانور بلکہ درندے ہیں لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ جن قوموں نے اس قسم کی مثالوں کو سامنے رکھ کر نشوونما پائی ہے انہوں نے خود بھی قصداً اس قسم کے عادات وخصائل اختیار کر لئے ہیں وہ دوسروں پر جھپٹتے ہیں غراتے ہیں اور موقع پاکر دبوچ لیتے ہیں اسی طرح اگر ہندوؤں کے دل میں حلم اور عدم تشدد کا غلبہ ہے تو اس پر بھی کوئی تعجب نہ ہونا چاہیئے کیونکہ ان کا قومی نشان گائے ہے (میری کہانی صفحہ ۱۵ جلد دوم۔

مہا بھائی جہاںتے تو زیادہ سے زیادہ گائے کی مذہبی عظمت کا راگ الاپتے ہیں۔ اور عوام کو مذہب کا واسطہ دیکر بقر عید وغیرہ کے سلسلہ میں جنگ وجدال کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ مگر راشٹرپتی جی گائے کی بزرگی پر ایک جدید سائنٹفک دلیل قائم کرتے ہیں تاکہ گائے کی حفاظت یا سلم آزادی کا جذبہ دوہری طاقت حاصل کرلے اسی لئے گائے کو ہندوؤں کا قومی نشان ثابت کرنے کی ترکیب نکالی گئی ہے اور یہ واضح اور روشن ہے کہ ہر قوم اپنے

دی نشان کی حفاظت اس وقت تک ضروری خیال کرتی ہے جس وقت تک
کسی ایک فرد قوم میں بھی تاب و تواں باقی رہتی ہے اور اس کو بچانے کا
ش سخت ترین مصائب میں مبتلا ہو کر بھی ابھرتا رہتا ہے اور یہ ہے بھی ضروری
دلانہ کیونکہ قومی نشان کا وجود قومی وجود اور قومی حیات کی علامت ہوتا
ہے اگر قومی نشان فنا یا کمزور ہو جائے تو گویا قوم مٹ گئی یا اتنی ناتوان
چکی ہے کہ اپنی حفاظت کی صلاحیت و قوت نہیں رکھتی۔ اب بتلایئے
کس مہاشے کے ذہن میں گئو رکھشا کی یہ سائنٹفک ترکیب آسکتی تھی ؟
گز نہیں اس قسم کی شطرنجی چالیں تو جنگ آزادی کا کمانڈر ہی ایجاد کر سکتا
کہ جذبات امن سوزی بھی بھڑک جائیں اور کوئی آسانی سے راشٹرپتی
کے کرتب کی تہ کو بھی نہ پا سکے۔ آخر جب ایک ہندو یہ یقین رکھے کہ گائے
قومی نشان ہے تو وہ مسلمانوں کو کس طرح قربانی کا فریضہ ادا کرنے دیگا
کھلم کھلا اس بات کی کوشش کرے گا کہ چاہے ہزار مسلمان کام
ئیں مگر اس کا قومی نشان گائے محفوظ رہ جائے۔ اب کوئی بتائے کہ
نوں سے لڑنے کی ایسی موثر ترکیب کوئی سمجھتی اور جہاسبھائی مہاشہ
تجویز کر سکتا تھا۔ گو وہ بھی تلقین تو یہی کچھ کرتا ہے مگر دل کی بات
دل تک آجاتی ہے۔ پنڈت جی کے لفظ گرفت سے باہر ہیں مگر زیادہ موثر
گئو ہتیاروں کو سیسے کی گولی سے اڑا دینے کے لئے شاستروں

میں آگیا (حکم) ہے چاہے گئو کھا تک کوئی گورا ہو یا کالا۔
(اخبار ملاپ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء)

اثر کے اعتبار سے پنڈت جی کی چال زیادہ گہری اور زیادہ نتیجہ خیز ہے بلکہ موصوف نے مہاشوں کے ارمانوں کو عملی دنیا میں لانے کے لئے جو کام کیا ہے اس کا فائدہ وہی ہے جو تلوار کو زہر میں بجھانے سے ہو ہے عرض فکر گئو رکھشا کا یہ جذبہ دلیل قوی ہے اسبات کی کہ پنڈت جی بڑ کٹر ہندو ہیں۔ پرمانند اور ساورکر سے بھی زیادہ۔

پنڈت جی بھگت کے روپ میں عام طور پر تمام ہندو فرقے کسی کسی جانور کا گوشت کھاتے ہیں (ایک جینیوں کی جماعت ضرور گوشت خوری سے بچی ہوئی بتلائی جاتی ہے) لیکن جب کوئی ہندو کٹر قسم کا ہندو بننا چاہتا ہے تو وہ گوشت خوری چھوڑ کر ساگ پات اور دال بھات پر گذارہ کرنے لگتا ہے اس طرز زندگی سے اس کو بھگت کا لقب مل جاتا ہے اور یہ لقب عرف عام میں اسبات کی سند ہوتا ہے کہ اب یہ شخص اول درجے کا کٹر ہندو ہو گیا ہے اور تجربہ بتلاتا ہے کہ ایسا شخص گوشت خور لوگوں کا سخت ترین دشمن ہو جاتا ہے۔ خاص کر ان کا جو گائے کا گوشت کھاتے ہیں اور اس کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان گئو ہتیاروں کو تباہ و برباد کردے اور ان کو مٹانے کی ہر جائز و ناجائز تدبیر میں مصروف رہنا فرض

حیات سمجھتا ہے راشٹریتی جی بھی باقرار خود کسی زمانے میں عام کشمیری برہمنوں اور دیگر گوشت پسند ہندوؤں کی طرح کام و دھن کو لذت آشنائے گوشت کیا کرتے تھے لیکن جب آزادی کی جنگ میں شریک ہوئے تو گوشت کھانا ترک کر دیا اور باقاعدہ بھگت بن گئے اور یہ روپ اس لئے بھرا گیا کہ گوشت خوری کی حالت میں مسلم دشمنی کی تکمیل بطریق احسن نہ ہو سکتی تھی اسی بنا پر اسباب قوت عداوت تلاش کئے گئے اور اس ذیل میں گوشت خوری کا ترک موثر حربہ نظر آیا کیونکہ صرف یہی ایک چیز تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں سے گونہ تعلق باقی رہتا تھا مگر راشٹریتی جی نے دوسرے بھگتوں کی طرح دشمن سے دشمنی کرکے اپنا مطلب نکالنا مناسب نہ سمجھا بلکہ دوستی کا لباس زیب جسم فرما کر دشمن کا شکار بہتر خیال کیا اور یہ طریقہ فی الواقع تھا بھی زیادہ کامیاب اس لئے کہ خنجر گلے مل کر ہی رگ حیات کو قطع کر سکتا ہے اور سانپ آستین میں بیٹھ کر ہی رگ و پے کو زہر قاتل کی جولانگاہ بنا سکتا ہے دوری اور غیریت سے کام نہیں نکل سکتا۔ پنڈت جی نے اپنے بھگت ہونے کی داستان حسب ذیل الفاظ میں بیان کی ہے۔

"قریب قریب عام کشمیری برہمنوں کی طرح ہمارا خاندان

بھی گوشت کھاتا تھا۔اس لئے بچپن سے میں بھی گوشت
کھاتا رہا اگرچہ مجھے اس کا شوق نہ تھا ۱۹۲۰ء میں جب
عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو میں نے گوشت
کھانا ترک کر دیا اور نباتی غذا کا پابند ہو گیا چھ برس تک
میں نے گوشت نہیں کھایا لیکن یورپ جا کر کھانے لگا۔
ہندوستان اگرچہ پھر چھوڑ دیا اور اس وقت سے اب تک
میں کم و بیش نباتی غذا کا پابند رہا ہوں گوشت مجھے موافق
آتا ہے لیکن اب مجھے اس سے رغبت نہیں رہی ہے۔
بلکہ کراہت معلوم ہوتی ہے میری کہانی صفحہ ۱۹۶ جلد دوم۔
دیکھا آپ نے اگرچہ گوشت پنڈت جی کے مزاج کے موافق پڑتا
ہے مگر وہ اس سے رغبت نہیں رکھتے بلکہ نفرت فرماتے ہیں پھر جن
لوگوں کے منہ سے گوشت کی بو اور وہ بھی گائے کے گوشت کی (جو
پنڈت جی کا قومی نشان ہے) آتی ہوگی۔ان سے پنڈت جی کیونکر
نباہ کر سکتے ہیں اور پنڈت جی کے دل میں ایسے لوگوں کے لئے کیونکر
جگہ پیدا ہو سکتی ہے اور اگر کہیں پنڈت جی محبت و الفت کا دم بھرتے
نظر آئیں تو اس کا مفہوم و مطلب کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔

پنڈت جی کی جین مت سے دلچسپی

جین مت بھی ہندوازم کی ایک ہری بھری شاخ ہے۔ یہ فرقہ کم و بیش سارے ہندوستان میں پایا جاتا ہے ہمیں اس کے اصول و قواعد کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں مگر اتنا ضرور علم ہے کہ اس فرقے کے لوگ گوشت کھانے والوں سے سخت عداوت رکھتے ہیں اور مسلمان چونکہ گائے کا گوشت بھی کھاتے ہیں اس لئے ان کو ایک آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ان لوگوں کی ایک مزیدار علامت شناخت یہ ہوتی کہ اپنے منہ پر کپڑے کی ایک گدی باندھے رہتے ہیں تاکہ کوئی جاندار ہوا میں ملکر دہن میں نہ جانے پائے اور جیو ہتیا کا ارتکاب نادانستہ بھی نہ ہو جائے۔ پنڈت جی کا رجحان بھی زیادہ تر اسی عجیب و غریب جماعت کی طرف ہے۔

جینیوں کا روایتی نقطہ نظر جو اصولاً اخلاقی ہے مگر غیر مذہبی یا یوں کہئے کہ مذہبی تشکیک سے متاثر وہ مجھے بہت بھاتا ہے اگرچہ جینیوں نے جس طرح اُسے زندگی پر نافذ کیا ہے اس سے میں متفق نہیں مجھے دلچسپی ہے ان کے تاؤ سے ان کے طریق حیات سے اس راستے سے جس پر کہ ان کے نزدیک چلنا چاہیئے۔ زندگی کو سمجھنا چاہیئے اور اس کو بہتر بنانا چاہیئے۔ میری

کہانی صـ۱۶۶ جلد دوم۔

چونکہ پنڈت جی جدید تعلیم سے آراستہ ہیں اس لئے جین مت میں تھوڑی سی ترمیم چاہتے ہیں۔ باقی ہر طرح اتفاق ہے سو وہ ترمیم کچھ دشوار نہیں ہے اس لئے کہ ہندو ازم میں مناسب حال ہزاروں ترمیمیں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ غرضکہ جین مت سے یہ دلچسپ دلیل ہے کہ پنڈت جی ہندو ہیں اور اُن کو اختیار ہے کہ جس فرقہ میں چاہیں شامل ہو جائیں سب ایک درخت کی شاخیں ہیں۔

پنڈت جی اور کاشی جی سے عقیدت

بنارس عام ہندوؤں کی عقیدت مندیوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ جس طرح متھرا جی، ہردوار جی، کے نام سے ہندو مذہبی زندگی کی مسرت حاصل کرتے ہیں اسی طرح کاشی جی کا تصور بھی ان کے دلوں میں جذبات عقیدت کو متلاطم کر دیتا ہے اور ہمارے پنڈت جی بھی اپنی قوم کے دیگر افراد کی طرح بنارس کی محبت میں سرشار نظر آتے ہیں اور اگر ممالک عالم کی سیر کرنے والی نگاہوں کے لئے کسی شہر میں کوئی جذب محسوس ہوتا ہے تو وہ صرف بنارس ہی ہے۔

بنارس مشرق کا شہر لازوال (رومی سلطنت کے زمانے میں روم شہر لازوال کہلاتا تھا) کہا جاسکتا ہے نہ ہندوستان کا بلکہ تمام

مشرقی ایشیا کا لیکن بنارس نے کبھی سلطنت کا کھیل نہیں کھیلا
نہ کبھی دنیاوی اقتدار کی فکر میں سر کھپایا (میری کہانی ج ۱ ص ۲۵۰)

آخر ہندوستان میں دہلی۔ لکھنؤ۔ آگرہ۔ لاہور وغیرہ دوسرے شہر بھی تو تھے جو گوناگوں حالات کی وجہ سے لائق تذکرہ ہو سکتے تھے مگر پنڈت جی کی نظر میں کچھ وزن ہے تو صرف بنارس کا اس کی صریحی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ موصوف کے نزدیک دوسرے شہروں کو کسی قسم کی مذہبی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ انہیں پراچین تہذیب کے آثار نہیں ہیں اور نہ رام راجی ایام کی کوئی یادگار۔ اور اگر ان کے دامن میں آثار قدیمہ کو جگہ حاصل بھی ہے۔ تو ان سے مسلمانوں کے ایام عروج کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کو دیکھ کر اہل اسلام کے دلمیں ترقی کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے اور پنڈت جی کے لئے یہ چیز بے حد سے زیادہ اندوہناک اور خطرناک ان کی نگاہ میں تو وہ شہر جچا ہوا ہے جس میں ان کے نفس نیم شعوری کی طرح ہندو قوم کی ہزار ہا برس کی روایات محفوظ ہیں۔ عجیب وغریب مندر پراچین طرز تعمیر کا پتہ دیرہے ہیں۔ نرالے انوکھے بت قدیم افسانوں کو دھرا رہے ہیں رنگ برنگے کھنڈر کہہ رہے ہیں کہ یہاں سنسکرت کا درس ہوتا تھا وہاں برہمچریہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ غرضکہ ہر شے زبان حال سے بتاتی ہے کہ یہ شہر کبھی زمانے میں ہندو قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا۔

دورِ حاضر میں بھی بنارس ہی ایسا شہر ہے جہاں پراچین تہذیب کے نمونے مل جاتے ہیں۔ مدن موہن مالویہ اور ان کی کمپنی کے دیگر ارکان جو مسلم نوازی میں خاص ملکہ رکھتے ہیں اسی مبارک دیار میں رہتے ہیں ہندو یونیورسٹی جس میں پراچین طریقوں پر نوجوان ڈھالے جاتے ہیں اسی جگہ ہے پراچین زبان یعنی سنسکرت کی تعلیم گاہ یہی ہے۔ بھلا یہ دلچسپیاں کسی اور شہر میں کہاں جو پنڈت جی تذکرے کی زحمت گوارہ فرمائیں وہ تو ہندو مذہب پراچین تہذیب ہندو آثار وغیرہ کے دلدادہ ہیں اور یہ چیزیں ان کو جس شہر میں نظر آ رہی ہیں اسی کے تصور میں مگن اور قصیدہ خوانی میں رطب اللسان ہیں۔ وہ ہندوستان کے شہروں پر مورخ کی حیثیت سے نگاہ نہیں ڈالنا چاہتے۔ وہ تو صرف ہندو قوم سے تعلق پر نگراں ہیں اور اس کی دلیل خود ان کے تحریر کردہ الفاظ ہیں کہ بنارس کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ ایک مذہبی شہر رہا ہے۔ اس نے دہلی لکھنؤ اور آگرہ کی طرح دنیاوی اقتدار کی فکر میں سر نہیں کھپایا۔ لطیفہ تو یہ ہے کہ پنڈت جی جذبات عقیدت کی رو میں اس طرح بہہ رہے ہیں کہ شاعرانہ مبالغے سے بھی احتراز نہیں کرتے اور جرأت مستانہ کے ساتھ بنارس کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ سارے ایشیا کا سرتاج بنائے دیے رہے ہیں۔ مگر یہ کوئی تعجب انگیز حرکت نہیں کہی جا سکتی اس لیے کہ قلبی ربط سب کچھ کہلوا ڈالتا ہے۔ چہ کند عقل

کو مسحور توام۔

پنڈت جی کی نگاہ میں ہندوستان دیوی کے لباس میں

ہندوؤں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز کو کسی نہ کسی اعتبار سے دیوی یا دیوتا کا مرتبہ دیدیتے ہیں، اسی وجہ سے دیویوں اور دیوتاؤں کا کوئی شمار نہیں ہے۔ سنا جاتا ہے کہ جب ہندوستان میں ریل پہلی پہل آئی تو بعض ہندوؤں نے انجن کی عجیب وغریب ہیئت دیکھ کر دیوتا سمجھ لیا اور اس سلسلے میں ڈرامیورروں کو خوب پوری کچوری اڑانے کا موقع ملا۔

دیوی اور دیوتا سازی کا شوق اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین کو بھی ایک دیوی سمجھ کر بھارت ماتا کا لقب دیدیا گیا اور اس کو بعض حالات ومعاملات میں موثر تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس شوق کو اتنی عمومیت حاصل ہوئی ہے کہ جدید تعلیم سے آراستہ روشن خیالی کے دعویدار ہندو بھی اس کے اثرات سے باہر نہیں ہیں اور بھارت ماتا کی جے کا نعرہ لگاتے ہوئے لذت محسوس کرتے ہیں حتیٰ کہ راجہ خود پنڈت جی جیسا عالی دماغ اور صاحب علم وفہم مدبر بھی عوام کی طرح بھارت ماتا کے تصور سے جذبات گل میں بیداری کی ہر پارہا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان ملکوں کو بھی اپنی طرح مجسم تصور کئے بغیر نہیں رہ سکتا یہ عادت اور قدیم التفاتات کا

اثر ہے چنانچہ ہندوستان بھارت ماتا۔ مادر ہند ایک خوبصورت
خاتون کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو بہت بوڑھی ہیں۔ مگر
دیکھنے میں سدا جوان معلوم ہوتی ہیں ان کی آنکھیں غم سے
بھری اور دل حسرت و یاس سے معمور ہے۔ بدیسیوں کے
ظلم سے نالاں ہیں اور اپنے بچوں کو مدد کے لئے پکارتی ہیں یہی
تصور ہے جو لاکھوں آدمیوں کے جذبات کو ابھارتا ہے اور
انہیں عمل اور ایثار پر آمادہ کرتا ہے۔ میری کہانی صفحہ ۴۲ جلد دوم
بیان مذکور کی یہ تاویل ممکن نہیں ہے کہ یہ خیالات دوسرے ہندوؤں
کے بیان کئے گئے ہیں اس لئے کہ اگر خود پنڈت جی بھارت ماتا کے چرنوں
میں سر نیاز مندی مد رکھے ہوتے تو جذبات عمل کے ابھرنے اور ایثار
کا تخیل ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ مانا کہ اور بھی لاکھوں کیا کروڑوں
انسان اس تصور سے زندگی حاصل کرتے ہیں مگر پنڈت جی بھی ان کی
صف میں گل سر سبد کی طرح نمایاں ہیں دوسروں کے تاثرات اس لب و
لہجہ میں ادا نہیں کئے جاتے جو پیش نظر سطور میں اختیار کیا گیا ہے
یہ امر تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس جوش و خروش کے ساتھ اپنے نفس
کی کیفیت بیان کی جا رہی ہے اور ذاتی احساسات کو لفظی جامہ پہنایا جا
رہا ہے اور یہ حقیقت خود بخود عریاں ہو رہی ہے کہ پنڈت جی

ہندوستان کو اپنے ہمقوموں کی طرح ایک دیوی تسلیم کرتے ہیں اور جنگ آزادی کے سلسلے میں ایثار و عمل کے جو مظاہرے ہوتے ہیں ان کی محرک اصلی کسی حد تک بھارت ماتا کی عقیدت بھی رہی ہے بہرصورت پنڈت جی کا ہندوستان کو دیوی سمجھنا دلیل ہے اس بات کی کہ ممدوح کے طائر خیال کی پرواز ہند و تصورات و اعتقادات تک محدود ہے

پنڈت جی رام لیلا کے عقیدت مندوں کی صف میں

رام لیلا ہندوؤں کا ایک مذہبی تیوہار ہے جو رام جی کی فتح و فیروزی کی یادگار میں ہر سال منایا جاتا ہے اور ہندو اس میں والہانہ حصہ لیتے ہیں۔ اس تیوہار سے رام راج کی یاد تازہ رہتی ہے اور اس کو پھر زندہ کرنے کا تصور قوت حاصل کرتا رہتا ہے اور یہ مظاہرہ ہندو قوم کی پراچین تہذیب کے مناظرہ پیش نظر کردیتا ہے۔

بہرصورت یہ مسلمہ امر ہے کہ رام لیلا کو ہندو قومیت کی تعمیر اور حیات سے بہت گہرا تعلق ہے اور اس کو جو کچھ بھی اہمیت حاصل ہے وہ مذہبی حیثیت سے حاصل ہے یہ محض ایک کھیل یا تماشہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تشکیل ہندو قومیت و مذہب کی روشنی میں ہوئی ہے اور اس کو سالانہ مذہبی و قومی فریضہ کے طور پر ادا بھی کیا جاتا ہے۔ اگر یہ صرف ایک تماشہ ہوتا تو اس کی نمائش کے لئے خاص وقت کی ضرورت نہ تھی بلکہ ہر موسم میں

اس کو کھیلا جا سکتا تھا۔ یہ وقت کا تعین بجائے خود اس کی مذہبی نوعیت کا آئینہ دار ہے۔ پنڈت جی بھی اس مذہبی فریضے کی ادائیگی کو اپنے ساٹھ فلک انداز میں لازم قرار دیتے ہیں اور الہ آباد میں رام لیلا کی بندش پر اپنے تاثرات کا جس حسرت آمیز لہجہ میں ذکر کیا ہے وہ اسی حقیقت کا غماز ہے۔

بوڑھوں اور جوانوں کو چھوڑیئے الہ آباد کے بچوں نے آٹھ نو برس سے یہ کھیل تماشے نہیں دیکھے ہیں اور ان کی روکھی پھیکی بے رس زندگیوں میں جوش مسرت کا جو ایک خوشگوار دن آجاتا تھا اس سے بھی وہ محروم ہو گئے۔ (میری کہانی صہ۳۳ جلد اول۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ رام لیلا محض کھیل نہیں ہے بلکہ اس کے پردے میں ہندو مذہب کی رنگینیاں کارفرما ہیں اور اسی وجہ سے بوڑھوں جوانوں کا تو ذکر ہی کیا بچوں کی بے رس زندگیوں میں بھی مسرت کی لہر پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ ہندو قوم کی ہر فرد خواہ کسی سن و سال کی ہو اس سے اثر پذیر ہوتی ہے اس لئے کہ ان کے اوتار رام جی نے لنکا کے راون نامی راجہ کو شکست دیکر تاج و تخت حاصل کیا ہے بچھڑے ہوئے ملے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے دل جڑے ہیں اسی کامیابی و کامرانی کا تصور خوشی اور

سرور سے ہمکنار کرتا ہے اور جس روز یہ افسانہ پارینہ عملاً دکھایا جاتا ہے
وہ دن بھی خوش گوار معلوم ہوتا ہے اور اگر کسی وجہ سے اس پر کچھ
ابندیاں عائد کردی جائیں تو کسی اور کا کیا ذکر جواہر لال جی کے دل کی
مرجھا جاتی ہے اور وہ اس احساس کی غم خیزیوں سے مجبور ہو کر فریاد
تے ہیں کہ آہ ایک ذریعہ تھا قومی تجمل و وقار کی یادگار کا وہ بھی بند
گیا لہٰذا غور کرتے ہیں کہ کس طرح اس قومی و مذہبی مظاہرے کو بروئے
رلایا جائے اس لئے کس سادگی سے فرماتے ہیں کہ رام لیلا تو پژمردہ
لوں میں جوش مسرت پیدا کرنے کا سبب تھا اسے پھر جاری ہونا چاہیئے
یہ ایک کٹر ہندو کے خیالات نہیں ہیں؟ کیا مہاسبھائی اس کے سوا کچھ
ور کہتے ہیں؟

پنڈت جی کی ہندو مت کتابوں سے دلچسپی

چونکہ ہندو مت کے مقررہ اصول وضوابط اور معاشرتی وتمدنی معینہ قواعد نہیں ہیں
اس لئے ہندوؤں پر مذہبی کتابوں کا مطالعہ لازمی وضروری قرار نہیں دیا
گیا ہے کروڑہا ہندو ایسے ملتے ہیں جن کو کسی مذہبی کتاب کا نام تک معلوم
نہیں ہوتا۔ صرف ان کا ہندو گھرانے میں پیدا ہونا ہی ہندو کہلانے کے لئے
ی سمجھا جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس قوم کی تشکیل کسی مشترک نظریۂ
حیات کی بنا پر نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ ہندو نام ہے ایک نسلی قوم کا۔ ہاں جو لوگ

کٹر قسم کا ہندو بننا چاہتے ہیں وہ مذہبی کتابوں کو پڑھ کر ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی قسم کی ہیئت کذائی بناتے جو ان کے لکھنے والوں کی تھی پنڈت مدن موہن مالویہ، ساورکر، مونجے اور گاندھی جی کی خود پرستانہ ذہنیت انھیں کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ جواہر لال بھی ادعائے آزاد خیالی وجدت پسندی کے باوجود ہندو مت کی کتابوں کا مطالعہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے ممکن فائدہ اٹھا کر دل ودماغ کی وسعتوں کو انہیں خیالات وتصورات سے معمور کرتے ہیں جو کٹر قسم کے ہندوؤں کا طرۂ امتیاز ہیں اور وہ غیر ارادی طور پر اثر پذیری کا اظہار بیان کر دیتے ہیں۔

بھاگوت گیتا کے مابعد الطبیعی مضامین کو نہ تو میں سمجھتا تھا اور نہ اس طرف کچھ رغبت ہی تھی۔ البتہ میں ان اشلوکوں کو اکثر سنا کرتا تھا جو گاندھی جی کے آشرم میں پرارتھنا کے وقت پڑھے جاتے تھے۔ میری کہانی ص ۱۳۱ جلد اوّل

گاندھی جی جس طرح بساطِ سیاست کے بادشاہ مانے جاتے ہیں اپنے مذہب کی ترویج وتبلیغ میں بھی یکتا ہیں اور پنڈت جی جتنے کچھ گاندھی جی سے متاثر ہیں وہ ہم خود موصوف ہی کے لفظوں میں بیان کر چکے ہیں۔ اس لئے پنڈت جی کا بھاگوت گیتا سے شغف تعجب انگیز نہیں ہے مگر دعوی

دہریت کے پیش نظر لطف کی بات یہ ہے کہ پنڈت جی صرف گاندھی آشرم میں ہی جا کر ہندو طریق عبادت پہ عمل نہیں کرتے بلکہ وہ ہر حال میں اور ہر جگہ اکثر و بیشتر ان اشلوکوں کو پڑھتے رہتے ہیں. جو گاندھی آشرم کی عبادت کا جزو ہیں تاکہ کہیں کمی کے ساتھ پڑھنے کی وجہ سے ہندو تخیل کمزور نہ پڑ جائے اور ہندو قومیت کے رواج کا جذبہ مضمحل نہ ہو جائے برہدارنیک اُپنشد کے مطالعہ کے اثرات حسب ذیل بیان سے ظاہر کئے گئے ہیں۔

> مجھے مجاز سے حقیقت تک پہونچا دے اندھیرے سے روشنی تک موت سے حیات دوام تک، (برہدارنیک اپنشد ۱-۳-۲۷) یہ گانتری منتر یہ علم و بصیرت کی دعا ان دعاؤں میں جو آج کل بھی لاکھوں آدمی روزانہ پڑھتے ہیں سب سے زیادہ مشہور ہے. میری کہانی صفحہ ۲ جلد دوم۔

پنڈت جی کی پرارتھنا کا طریقہ تو آپ معلوم ہی کر چکے کہ اس میں گاندھی آشرم میں بطور عبادت کام آنے والے بھاگوت گیتا کے اشلوک ہیں۔ اب دعا کا انداز بھی دیکھ لیجئے کہ وہ برہدارنیک اپنشد سے اخذ کی گئی ہے یعنی پنڈت جی کو علم و بصیرت کا سرمایہ آریوں کی کتابوں سے ملتا ہے۔ اور آریوں کو دیگر اقوام ہند سے جو دلچسپی ہے وہ کسی تبصرے کی محتاج نہیں

ہے اور اس حقیقت کا ظہور پنڈت جی کی عروسِ مذہب کے چہرے کو بھی بے نقاب کر رہا ہے۔

فرقہ پرست آریہ لیڈروں سے پنڈت جی کی عقیدت

پنڈت جی بہت بڑے قوم پرست مشہور ہیں اور فرقہ پرستی سے آپ کی نفرت و بیزاری کی شہرت آفتاب نصف النہار بنی ہوئی ہے لیکن عجیب تماشہ ہے کہ یہ قوم پرستی کا مجسمہ ان آریہ لیڈروں کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے جو شدھی سنگٹھن پراچین تہذیب اور رام راجیہ کے سب سے بڑے پرستار ہیں جن کی آنکھوں میں صرف ہندو مفاد اور ہندو قوم کی بہبود بسی ہوئی ہے۔ جو دیگر اقوامِ ہند کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے۔ شردھانند اور بال گنگا دھر تلک وغیرہ سنگٹھنیوں کی وطن دوستی اور قوم نوازی کی اصلیت سے کون واقف نہیں ہے مگر پنڈت جی کی نظر میں ان لوگوں کی صورتیں پھر رہی ہیں، ان کی یاد سے دل بیتاب آنکھیں پُرآب اور وہ لوگ قابلِ صد ملامت و نفرین جنھوں نے ملک دشمنوں کو ان کے وطن فروشانہ منصوبوں میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

سنہ [illegible]ء کے آخر میں ایک بڑا اندوہناک حادثہ پیش آیا جس نے سارے ہندوستان میں ہلچل ڈال دی اس سے روشن ہو گیا کہ ہم فرقہ پرستی کے جوش میں کتنی ذلیل سے ذلیل حرکت کر سکتے ہیں

سوامی شردھانند بستر علالت پر پڑے تھے اور ایسی حالت میں انہیں ایک مذہبی دلیوانے نے قتل کر دیا اس شخص کو جو گورکھوں کے برچھوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا تھا اور گولیوں کی بوچھار میں بڑھتا چلا گیا تھا یہی موت نصیب ہونا تھی

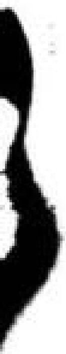
میری کہانی ص۲ جلد اول۔

شردھانند جی کو مسلمانوں سے جو محبت والفت تھی وہ محتاج اظہار نہیں ہے اور انہوں نے رسول اسلام کے متعلق جو گستاخیاں روا رکھی تھیں وہ کافی سے زیادہ روشن۔ لیکن پنڈت جی کو اس سے کیا غرض کہ سوامی شردھانند کے انسانیت سوز طرز عمل سے پونے دس کروڑ اسلامیان ہند کے دل چھلنی ہیں وہ تو جوش نیاز و جذبہ عقیدت میں فرقہ پرستوں کے سرگروہ کی مدح کا قصیدہ پڑھتے ہیں اور پڑھنا ہی چاہئے اس لئے کہ جدید وئی لغت میں حقیقی قوم پرستی اور وطن دوستی کا مفہوم یہی ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ اور دہریت آشنا بنا کر تباہی و بربادی سے ہمکنار کر دیا جائے اور جو لوگ ایسے مبارک کام کو انجام دینے کی کوشش کریں ان کو سراہا جائے چند سطر کے بعد پنڈت جی سے جذبات عقیدت دبائے نہیں دبتے اور ارشاد فرماتے ہیں۔

میں ہمیشہ سے جسمانی دلیری کا معترف ہوں اس دلیری کا جس

کی بدولت انسان ایک اعلیٰ مقصد کے لیے مرتے دم تک جسمانی مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔ میرے خیال میں اور لوگ بھی اس کی اتنی ہی قدر کرتے ہوں گے سوامی شردھانند میں یہ دلیری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ان کا لانبا قد گیروے کپڑوں میں لپٹا ہوا شاندار جسم بڑھاپے کے باوجود تن کر چلنا آنکھوں سے شرارے نکلنا دوسروں کی کمزوری کو دیکھ کر تیوری پر بل پڑ جانا یہ تصویر میری آنکھوں میں پھر رہی ہے اور دل پر نقش ہے میری کہانی صفحہ ۲۷۳ جلد اوّل

ایک کٹر مہاشے صاحب کے کردار کی عظمت کا سکہ جمانے کے لئے اس سے زیادہ موثر انداز بیان اور کیا ہو سکتا ہے۔ مہاشے جی کی رفعت کا تصور پنڈت جی کے دل و دماغ پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ ان کی خاک کے ذروں کو دوش ہوا پر سیار ہوئے قرن گذر گئے مگر آج تک ان کے چہرے مہرے کا نقش دل پر موجود ہے اور رفتار گفتار کا سماں آنکھوں میں پنڈت جی نے سوامی شردھانند کے متعلق جو کچھ بھی ارشاد کیا وہ اپنے مقام پر درست ہو یا نہ ہو مگر اتنا پتہ ضرور چل گیا کہ راشٹرپتی کی طبیعت کا رجحان کدھر ہے اس لئے کہ اہل عقل کے نزدیک یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسان جس قسم کی طبیعت و عادت رکھتا ہے اسی قسم کے لوگوں کو پسند کرتا



ہے ایک شرابی اور ڈاکو سے کبھی امید نہ کیجیے کہ وہ نیک طینت اور پاکیزہ فطرت لوگوں کو اچھے لفظوں سے یاد کرے گا اسی طرح ایک بدوزاہد بدکاروں کو پسند نہیں کرسکتا لہٰذا پنڈت جی کی شردھانند سے عقیدت دلیل ہے کہ یہ دونوں حضرات مشترکہ جذبات و احساسات رکھتے ہیں اور ان کے خیالات و تصورات متحد ہیں اور پنڈت جی اسی آن بان ہندو ہیں جیسے کہ شردھانند جی تھے "بلکند ہم جنس با ہمجنس پرواز" سوامی اور پنڈت کے قلبی ذہنی جذباتی ذوقی اور مذہبی اتحاد کی طرف صریح اشارہ ہے جس کے بعد کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

تنبیہ پنڈت جی کے بیان پر تبصرہ کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں ہم موصوف کے طرز عمل کو برا خیال کرتے ہیں نہیں ان کا ایک ہندو ہونے کی حیثیت سے یہی فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کی افراد کی دل کھول کر تعریف کریں۔ ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہم ان کے مذہبی خیالات کو بے نقاب کردیں۔

پنڈت جی تلک کے چرنوں میں

سنگٹھنی مہاشوں میں تلک جی بھی کچھ کم شہرت کے مالک نہیں ہیں۔ آپ کو مسلم دوستی میں جو ید طولیٰ حاصل تھا وہ بھی محتاج بیان نہیں، پنڈت جی نے موصوف کی مدح میں ایک پرلطف قصیدہ تحریر فرمایا ہے، جس کا آخری حصہ حسب ذیل ہے۔

مجھے یہ شکایت سنکر مرہٹوں کے قابل قدر سپاہیانہ جوش کا دھیان
آتا تھا جس کا اظہار نہ صرف پچھلے زمانے میں ہوا بلکہ
آج بھی ہماری قومی جنگ میں ہو رہا ہے اور تلک جی کی تصویر
آنکھوں میں پھر جاتی تھی جو دنیا کی کسی قوت سے نہیں ڈرتا تھا
جس کا سر کٹ جائے مگر جھکتا نہ تھا۔

میری کہانی صـ۱۸۱ جلد دوم

مرہٹوں کا سپاہیانہ جوش و خروش تاریخ ماضی کے اوراق میں صرف
مسلمانوں پر ڈاکوؤں کی طرح گاہے ماہے چھاپے مارنے تک ختم ہو جاتا
ہے اور موجودہ قومی جنگ کے دوران میں بھی تلک وغیرہ عظیم القدر
لیڈروں کی عملی قوتیں مسلم مفاد کو کچلنے کے لئے ہی صرف ہوتی نظر آتی
ہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی ان بہادران قوم
سے کیوں عقیدت رکھتے ہیں اور پنڈت جی کا مذہب کیا ہے۔

انتباہ | پنڈت جی نے بعض مسلمانوں کو بھی اچھے لفظوں سے یاد کیا
ہے لیکن وہ مسلم اس شان کے ہیں کہ جنھوں نے جنگ آزادی میں شریک
ہونے کے بعد بھولے سے بھی ایک لفظ مسلم مفاد کے متعلق اپنی زبان
سے نہیں نکالا بلکہ اپنے تن من دھن کو ہندوؤں کی دلداری میں صرف
کرتے رہے اور اگر ان میں سے کسی نے مسلمانوں کی ہمدردی کا ذرا بھی

اظہار کر دیا تو وہ فوراً فرقہ پرستی کا مجرم بنا دیا گیا۔ کون ہے جو مولانا محمد علی مرحوم کے وطن اور قوم کے لئے جانبازانہ کارناموں کو فراموش کر سکے مگر اتنی سی بات پر کہ موصوف نے آخر عمر میں کانگریسی صاحبان کی ہندو پرستانہ ذہنیت کے رخ زیبا پر سے قومیت کے زریں نقاب کو ہٹانے کی سعی کی تھی۔ پنڈت جی مرحوم کا نام بھی تعظیم کے ساتھ لینا پسند نہیں کرتے اور ان کی ہر قسم کی قربانیوں کو طاق نسیاں کی زینت بنا دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس رویہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی کی قوم پرستی کی اصلیت کیا ہے یہی نا کہ اگر ہندو مسلمانوں کو صفحۂ عالم سے مٹانے کی بھی کوشش کرے تو پکا قوم پرست اور قابل صد آفرین اور اگر مسلمان اپنی حفاظت کے لئے ایک لفظ بھی کہہ دے تو اول درجے کا فرقہ پرست وطن دشمن سامراج پرست وغیرہ ہے

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

<u>پنڈت جی اور ہندی بیچارا</u> ہندوستان میں ہزاروں قومیں آباد ہیں اور عادات و خصائل، تہذیب و معاشرت کی طرح ان کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ لیکن جب سے جنگ آزادی کا سلسلہ شروع ہوا ہے عام طور سے یہ خیال قوی ہوتا جا رہا ہے کہ سارے ہندوستان میں ایک ایسی زبان کو رواج دیا جائے جو سہل اور عام فہم ہونے کے

ساتھ متفرق قوموں کی شیرازہ بندی میں بھی ممد و معاون ہو سکے۔ یہ نظریہ اپنی عظیم افادیت کے اعتبار سے بہت ہی اچھا اور اس قابل ہے کہ اس پر عمل کیا جائے مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایسے مفید ملک و قوم مسئلہ میں بھی اکثریت کی فرقہ پرستی رنگ لا رہی ہے اور اس کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے تمام قوموں کے سر پر سنسکرت مسلط کر دی جائے۔ حالانکہ یہ زبان اس حد تک مردہ ہو چکی ہے کہ اس کے اکثر حمایتی بھی بولنے اور لکھنے سے قاصر ہیں اور اکثریت کی اہم اکثریت ایسی ہے جو اس سے مطلقاً آشنا نہیں ہے۔ دیہاتیوں کا تو ذکر کیا ہے عام طور سے شہر میں رہنے والے اور تعلیم یافتہ ہندو بھی سنسکرت سے بس اس قدر تعارف رکھتے ہیں کہ وہ پراچین تہذیب کی یادگار ہے۔ لیکن یہی خواہان ملک مُصر ہیں کہ اسی مردہ زبان کو قومی اور وطنی زبان قرار دیا جائے۔ اسی لئے دن رات طرح طرح کے پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں اور بھارت ماتا کے سپوت ببانگ دُہل کہتے ہیں کہ:

بھارت ورش کی قومی زبان سنسکرت ہے (ماخوذ از بیان ستیہ دیو مطبوعہ اخبار تیج دہلی یکم مئی ۱۹۴۷ء)

لیکن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یک بیک سنسکرت کے تن مردہ میں روح نہیں ڈالی جا سکتی ہندی کو سامنے رکھا گیا ہے اور اس

میں سنسکرت کی کثیر آمیزش کر کے سادھوجی کی گدڑی بنا دیا گیا ہے مختصر یہ ہے کہ اکثریت کے ارباب حل و عقد ہندی کے نام سے سنسکرت کو جاری کرنے کی انتھک سعی کر رہے ہیں تاکہ رام راج تک پہونچنے کے لئے ایک اور راستہ تیار ہو جائے۔

دس بیس برس پہلے شاید ہی کوئی ہندی اخبار شائع ہوتا ہو مگر اب کثیر تعداد میں نظر آ رہے ہیں۔ ناول افسانے، تاریخ، جغرافیہ غرضکہ ہر قسم کا لٹریچر ہندی میں مہیا کیا جا رہا ہے بہت سی انجمنیں قائم کی گئی ہیں۔ جن کی زندگی کا مقصد صرف سنسکرت زدہ ہندی کی ترویج ہے اور یہ جماعتیں گاندھی جی وغیرہ کی سرپرستی میں خوب زور شور سے کام کر رہی ہیں۔ لاکھوں روپیہ سالانہ اس کام پر صرف کیا جا رہا ہے اور ہر طرف ہندی ہندی کا غلغلہ پڑا ہوا ہے۔ کانگریسی مہا سبھائی اچھوت اور دھاری سنگھٹن سب کے سب ہندو متحدہ قوت کے ساتھ مصروف کار ہیں اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکل رہا ہے عوام بہت آسانی سے اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور جو تھوڑی بہت ہندی سیکھ جاتا ہے وہ اس کے مبلغوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس مسلسل جدوجہد کا اثر پنڈت جی کے لفظوں میں ارباب نظر کے لئے سرمایہ عبرت و بصیرت ہو سکتا ہے۔

دو سال ہوئے ۱۹۳۲ء میں ایک انجمن نے جو محض قدرت
کی غرض سے جنوبی ہند میں ہندی زبان پھیلانے کا کام
کر رہی ہے۔ چند اعداد و شمار شائع کئے تھے اس سے
مجھے معلوم ہوا کہ چودہ سال کے اندر جب سے کہ وہ انجمن قائم
ہوئی ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ آدمیوں نے محض اس
انجمن کی کوشش سے احاطہ مدراس کے اندر ہندی زبان
سیکھ لی ایک ایسے ادارے کی کوشش جس کو سرکار کی طرف
سے کوئی مدد نہ ملے بہت قابل تعریف ہے۔ اکثر لوگ جو
ہندی زبان سیکھ لیتے ہیں وہ خود بھی اس زبان کی تبلیغ کا
کام کرنے لگتے ہیں۔ میری کہانی صفحہ جلد دوم

یہ تو صرف ایک انجمن کی کارگذاری کا تذکرہ ہے ورنہ ہندوستان
کے گوشے گوشے میں ایسی انجمنوں کا جال پھیلا ہوا ہے اور وہ سعی پیہم
میں مشغول ہیں پہلے فی الجملہ حکومت کی سرپرستی حاصل نہ تھی۔ مگر اب تو
سرکار دولتمدار بھی ہر طرح ہندی کو رواج دینے میں کوشاں ہیں پہلے
لالہ صاحبان اور سیٹھوں کی تجوریوں تھیلیوں سے اس کی تبلیغ و
ترویج کے لئے روپیہ نکلتا تھا اور اب تو حکومت کا خزانہ موجود ہے
راج گوپال آچاریہ سمپورنانند مسٹر شکلا وغیرہ کانگریسی وزراء عملی طور پر

اپنے ہندی پرستانہ عزائم کا اظہار کرچکے ہیں مختصر یہ ہے کہ ہندو میشنری کا ہر ہر پرزہ ہندی کی ترویج کے لئے سرگرم عمل ہے اور پنڈت جی بھی اپنے دوسرے بھائی بندوں کی طرح ہندی کی سرپرستی میں اپنے خاص انداز سے ساعی ہیں۔

ہندی ادب کا ماضی بہت شاندار رہا ہے لیکن اپنے ماضی پر وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتی مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بھی بہت شاندار ہے اور ہندی صحافت اس ملک میں بہت زبردست قوت بن سکتی ہے لیکن جب تک کہ عوام الناس کو بے دھڑک مخاطب نہ کیا جائے اور رسمی زبان کی پابندیوں سے آزادی حاصل نہ کی جائے اس وقت تک نہ صحافت ترقی کرسکتی ہے نہ ادب ۔ میری کہانی صفحہ ۳۰۶ جلد دوم

پنڈت جی نے ہندی پرچار کی جو ترکیب ارشاد فرمائی ہے وہ لاریب قابل داد اور لائق صد آفرین ہے ۔ پہلے تو نہایت سادگی سے فرمایا کہ اس کا ماضی بہت شاندار تھا حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اس لئے کہ تقریباً چھ سو سال سے اردو ہی اردو کا دور دورہ ہے ۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ رام راجیہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہو تاکہ ہندی نوازوں کے قلوب میں اس کی اہمیت وعظمت کا احساس قوی ہو جائے اور پھر توجہ دلائی کہ دیکھنا

کہیں ماضی کے نقش و نگار پر نہ بھول جانا۔ اگر مستقبل میں بھی اس کو شاندار دیکھنا چاہتے ہو تو اس کی ترویج میں خوب کوشش کرو صرف ماضی کا تصور کافی نہ ہوگا۔ اس کے بعد تسلی دیتے ہیں کہ گھبراتے کیوں ہو میدان عمل میں قدم بڑھائے چلو مجھ ایسے جہاندیدہ کو یقین ہے کہ تمہاری کوششیں بارآور ہوں گی اور ہندی کا مستقبل شاندار بلکہ بہت شاندار مگر دیکھو سمیات میں نہ الجھو فوراً عوام پر قبضہ جمانے کی فکر کرو پھر دیکھنا مٹے ہوئے نقش کیسے ابھرتے ہیں اور بگڑے ہوئے خط و خال کس طرح سنورتے ہیں۔ چنانچہ مشاہدہ بتلا رہا ہے کہ پنڈت جی کی ترکیب پر برابر عمل کیا جا رہا ہے۔ حکومت کا زور پبلک انجمنوں کی طاقت ہندی مستقبل کو شاندار بنانے میں صرف ہو رہی ہے اور راشٹر پتی کا خیالی اور وہمی یقین حقیقی یقین کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے کچھ دنوں اور مسلمانوں کو قوم پرستی کے نشہ میں چور رہنے دیجئے پھر تماشہ دیکھئے گا۔ مگر فی الحال اتنا بتا دیجئے کہ ہندو کس ذہنیت کے مالک کو کہتے ہیں اور پنڈت جی کا مذہب کیا ہے

ہندوؤں کے حقوق کی کمی پر پنڈت جی کی گریہ و زاری

پنڈت جی فرقہ وارانہ فیصلے سے بہت ناراض ہیں اور اس کے خلاف کافی سے زیادہ غم و غصہ کا اظہار کیا ہے کہیں اس کو آزادی کے راستہ میں روڑا بتلایا ہے کسی جگہ جدید قومیت کی تعمیر میں حارج کہا ہے، غرض ہی

کو ہر طرح بُرا اور فضول ثابت کرنے کے لئے خوب زورِ قلم صرف کیا ہے مگر افسوس کہ یہ ساری جانکاہیاں اس لئے نہیں ہیں کہ پنڈت جی ہی نفسِ فرقہ وارانہ فیصلے کو برا سمجھتے ہیں بلکہ سارے شور و شغب کی تہ میں وہی نفس نیم شعوری والے جذبات کام کر رہے ہیں کیونکہ اس فیصلے کے موجود ہوتے ہوئے رام راجیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر اس میں کوئی ایسی صورت پیدا کر دی گئی ہوتی کہ جس کی آڑ لیکر مسلمانوں کے لہو کا آخری قطرہ بھی چوسا جا سکتا پنڈت جی کی تمام ہمدردیاں اس فیصلے کے ساتھ ہو جاتیں مگر اتفاقاً کچھ کسر رہ گئی جس کی وجہ سے پنڈت جی کی زبان و قلم کو مبتلائے زحمت اختلافات ہونا پڑا۔

> ظاہر ہے کہ فرقہ وارانہ تصفیہ نہایت لغو اور ناقابل قبول ہے کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے ہندوستان کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں یہ اس وجہ سے نہیں کہتا کہ اس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ حقوق مل گئے۔ میری کہانی
>
> صفحہ ط ج ۲

پنڈت جی کے نزدیک فرقہ وارانہ فیصلے کی "لغویت" کی بنیاد اگر مسلم حقوق کی زیادتی کے خیال و وہم پر نہ ہوتی تو اس ارشاد کی ضرورت کیا تھی کہ میں فرقہ وارانہ فیصلے کی لغویت کا اس لئے قائل نہیں کہ اس سے

مسلمانوں کو بہت زیادہ حقوق مل گئے۔ دل میں جو چور تھا زبان تک آگیا اگر دل میں خیال یہ نہ تھا تو لفظی صورت میں یوں اظہار ممکن ہی نہ تھا۔ ذرا اور آگے بڑھ کر ہندو حقوق کے اس دانا محافظ نے رازِ دل یہ لا کہہ دیا ہے اور تاویل کا موقع بھی باقی نہیں۔

خصوصاً بنگال میں جہاں شیڈیول کاسٹ سمیت یورپین جماعت کو صحیح تناسب سے کہیں زیادہ حقوق مل گئے ہیں، ہندوؤں کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی ہے۔ یہ تصفیہ یا فیصلہ یا اسے جو کچھ بھی کہا جائے بہت سے لوگوں کو سخت ناگوار ہے چاہے یہ زبردستی نافذ کر دیا جائے اور سیاسی وجوہ سے لوگ عارضی طور پر اُسے برداشت بھی کر لیں مگر اس کی وجہ سے ہمیشہ فساد کی وجہ قائم رہے گی۔ میری کہانی صفحہ ۵۰ جلد دوم

اس بیان سے صاف آشکار ہے کہ اگر ہندوستان کی دوسری قوموں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہ دیا جاتا اور سب کی باگ ڈور اکثریت کے ہاتھ میں دیدی جاتی تو یہی قابلِ صد ملامت فرقہ وارانہ فیصلہ خیر مقدم کے لائق ہوتا اور اس سے امن عمومی قائم ہو جاتا مگر چونکہ اس میں بعض صوبوں میں اکثریت کی طاقت شباب پر نہیں ہے اس لئے یہ بنیاد فساد ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک کہ اکثریت کو اقلیتوں کی قسمت کا

ملک نہ بنا دیا جائے۔

اگر واقعاً پنڈت جی کو اس فیصلے سے اختلاف ہوتا اور محض ہندو حقوق کی حمایت مدنظر نہ ہوتی تو صوبہ سرحد کے متعلق کبھی بھولے سے ہی سہی دو چار لفظ لکھ ڈالتے جہاں مٹھی بھر ہندوؤں کو بہت زیادہ حقوق دیکر مسلمانوں کے گلے پر چھری چلائی گئی ہے مگر نہیں قوم پرست لیڈر ایسا ذکر نہیں کر سکتا۔ یہ تو فرقہ کا معاملہ ہو جائے گا وہ تو صرف قوم کے حقوق کی کمی پر سر و سینہ کوٹ سکتا ہے اور اسے وجہ فساد کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کر سکتا ہے معلوم نہیں اب پنڈت جی کے مذہب کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے گی۔

پنڈت جی اپنے ہندو ہونیکے خود اقراری ہیں

ہندو مذہب تمدن معاشرت اور رسم و رواج سے پنڈت جی کے دلی شغف اور ان کے رائج کرنے کے لئے طرح طرح رویاہ بازیوں کا تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے نے کی الفت ہندی کی محبت پراچین تہذیب کو زندہ کرنے کا تخیل م راجیہ کا تصور ویدک ایام کے پلٹ آنے کی آرزوئیں وغیرہ پنڈت جی کے مذہب کو آشکار کرنے کے لئے کافی ہیں مگر ممکن ہے کہ بعض مرعوب ہنیت اور مغلوب طبیعت والے افراد ان صریحی شواہد کے ہوتے ہوئے بھی شک و شبہ میں گرفتار ہو جائیں اس لئے ہم ایسے حضرات کی تسلی و تشفی

کے لئے پنڈت جی کا بیان پیش کئے دیتے ہیں جس میں انہوں نے بصورت نفی اپنے ہندو ہونے کا اثبات کیا ہے۔

میں کچھ ایسا بودا ہندو نہیں ہوں کہ تشدد سے اس لئے خائف ہوں کہ وہ تشدد ہے۔ میری کہانی صلے جلد دوم

یعنی پنڈت جی نرے ڈھنڈھی ترازو کے چکر میں پڑے رہنے والے ہندو نہیں بلکہ وہ جری بہادر اور صاحب ہمت ہندو ہیں کہ بے دھڑک انگلستوں کو کچل ڈالنے کے لئے مختلف تدبیروں پہ عمل پیرا ہوتے ہیں اور موت سے قریب ہو جانے والوں کو پتہ بھی نہیں چلنے دیتے کہ ان کا آخری وقت قریب آچکا ہے ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اگر پنڈت جی ہندو نہوں تب بھی انکی ہمدردیاں ہندوؤں کے ساتھ رہینگی

یہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ انسان جس ماحول میں ابتدائی پرورش و تربیت کی منزلیں طے کرتا ہے اور جن حالات میں اس کے ظاہری و باطنی قویٰ کی نشوونما ہوتی ہے مدت العمر اس کے اثرات سے آزاد نہیں ہوسکتا وہ اپنی تربیت کے ماحول کی ہر چیز سے محبت کرتا ہے اور ہر ادا سے الفت اور الفت و محبت کا یہ رنگ اسے اتنا محبوب ہوتا ہے کہ ہر منزل حیات میں اسی کا شیدائی رہتا ہے گو اور گو

کی چیزوں سے محبت افراد خاندان سے مودت، قوم اور قومی امور سے دلچسپی، وطن اور وطن کے حالات وکوائف سے وابستگی یہ سب ماحول کی ر اندازیوں کا کرشمہ ہے۔ ایک ہندوستانی ساری عمر یورپ میں گذارتا ہے۔ وہاں اس کے دوست احباب بھی ہیں وہاں کی تمام چیزیں استعمال بھی کرتا ہے لیکن جب کبھی اس کو کوئی ایسی چیز نظر آجاتی ہے جس کو ہندوستان سے نسبت ہو تو اس کی روح میں مسرت بدوش اضطراب پیدا ہو جائے گا اور وہ دنیا ومافیہا کی لذتیں اس چیز کے آغوش میں تو آرام پائے گا۔

ایک انگریز خواہ ہمارا کتنا ہی دوست کیوں نہ ہو لیکن جب اس کے ملک اور قومی مفاد کا سوال آجاتا ہے تو وہ تمام تعلقات کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیتا ہے اور ماحول کی تاثیر اپنی رعنائیوں کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے۔

پنڈت جواہر لال نے جس ماحول میں ابتدائی منازل تربیت کو طے کیا ہے ظاہر ہے کہ وہ ہندو ماحول تھا۔ ان کے گوشت پوست کی تعمیر ہندو اجزا سے ہوئی ہے۔ ان کی رگ و پے میں ہندو خون دوڑ رہا ہے۔ ان کی روح ان کا دل ان کا دماغ سارا وجود ہندو ہے اس لئے وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں تو ہندو آنکھ سے اور سنتے ہیں تو ہندو

کان سے اور اگر وہ شئے ہندو نظر کے مطابق نہیں ہوتی تو اسے بہتر
تدبیر ہندو بنانا چاہتے ہیں، ان کے دل و دماغ کی ہر حرکت ہندو دھرم
کے لئے ہوگی، ان کی ساری ہمدردیاں اور غم گساریاں ہندوؤں کے
واسطے ہیں، ان کی ذہنی وعلمی استعداد سے عملی طاقتوں سے محبت وطن
اور الفت قوم کے جذبات سے غیر ہندو کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں کر
سکتے اور اگر پنڈت جی چاہیں بھی کہ وہ غیر ہندو کی ہمدردی کا اظہار کریں
تو عمل کی دنیا میں وہ غیر ارادی طور پر ہندو مفاد کے لئے ہاتھ پیر مارتے
نظر آئیں گے جیسا کہ خود اقرار کرتے ہیں۔

واقعات پر بحث کروں لیکن چاہے جتنی کوشش کروں جہاں
ایشیائی لوگوں کا تعلق ہوتا ہے میری ایشیائیت کا اثر میری
قوت فیصلہ پر ضرور پڑتا ہے۔ میری کہانی صفحہ ۳۳ جلد ۲۔

جب ایشیائی اور غیر ایشیائی کے سوال پر پنڈت جی کی قوت فیصلہ
متاثر ہو جاتی ہے اور وہ ایشیائیوں کی طرفداری پر مجبور ہو جاتے
ہیں تو لازمی طور پر ہندو اور غیر ہندو معاملات میں ان کی تمام ہمدردیوں
کا ہندوؤں کے ساتھ ہونا فطری امر ہوگا۔ اور وہ طبعی طور پر غیر ہندوؤں
کے مقابلہ میں ہندوؤں کی حمایت و طرفداری پر مجبور رہیں گے اس لئے
آنکھوں والوں کو اپنی بینائی سے کام لینا چاہیئے ہر چمکدار چیز سونا

نہیں ہوتی ممکن ہے وہ آگ ہوا ور بے خبری میں یک بیک خرمنِ حیات کو خاکستر بنا دے۔ زیرک اور دانا انسان دھوئیں کی گردشوں سے آگ کا پتہ لگا لیتا ہے اور احتیاطی تدابیر پر عمل پیرا ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح کسی قوم کے سربرآوردہ افراد کی ذہنیت سے قوم کی ذہنیت کا پتہ چل سکتا ہے اور خطرے کا وقت کچھ نہ کچھ ضرور بعید کیا جا سکتا ہے۔

تصویر کا دُوسرا رخ

رفع اشتباہ ممکن ہے بعض افراد کے دل میں یہ سوال پیدا ہو جائے کہ جب پنڈت جی ہندو دھرم کے سخت ترین پرستار اور شیدائی ہیں اور اس کے ہر جزو کو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو آخر مذہب کے خلاف زہرافشانی کا مطلب کیا ہے لیکن درحقیقت اس قسم کے شکوک میں گرفتار ہونے والے لوگ وہ ہو سکتے ہیں جنھوں نے پنڈت جی کی افکار کا بنظر غائر مطالعہ نہیں کیا ہے اگر بصیرت وانصاف کے ساتھ ممدوح کی خلاف مذہب تحریروں کو جانچا پرکھا جائے تو یہ راز خود بخود آشکار ہو جاتا ہے کہ کسی ایک جگہ بھی مطلق مذہب کے خلاف زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی سعی نہیں کی گئی ہے بلکہ ہدف ملامت کوئی مخصوص مذہب ہے ورنہ اگر پنڈت جی مطلق مذہب سے جنگ آزما

ہوتے تو ہندو دھرم کے رسوم و خیالات کو سراہنے کی ہر جائز و ناجائز کوشش نہ کرتے۔ ساری میری کہانی کا مطالعہ کر جائیے ہر جگہ جس طرح بھی ہو سکا ہے ہندو دھرم کے مخصوصات کو کسی نہ کسی رنگ میں انسانیت کے لئے ضروری اور مفید ظاہر کیا گیا ہے۔ کہیں گائے کو قومی نشان بتایا ہے کسی جگہ بنارس کو شہر لازوال فرمایا ہے، کسی مقام پر بھارت ماتا کے تصور سے قوت ایثار و عمل کو بیدار کیا ہے۔ کہیں پراچین تہذیب کے محاسن بیان کئے ہیں کہیں رام راجیہ کے تخیل سے غذائے روح بہم پہونچائی گئی ہے۔ غرضکہ جہاں بھی ہو سکا اور جس طرح بھی بن پڑا ہندو مت سے متعلق امور کا قصیدہ پڑھا گیا ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ مطلق مذہب پر حملہ نہیں بلکہ کسی خاص مذہب کو پیش نظر رکھ کر نفرت و ملامت کے تیروں کا مینہ برسایا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ خاص مذہب کونسا ہے تو اس کو خود پنڈت جی نے اپنے خلاف مذہب بیانات میں بطریق خاص ظاہر کر دیا ہے۔ ہاں فی الجملہ مختلف بیانات کو ایک جگہ رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ آئینے کے مقابل آئینہ آتا ہے تو راز درون پردہ برانگندہ نقاب ہو جاتا ہے۔

پنڈت جی کی مذہب دشمنی کی حقیقت

پنڈت جی کے نزدیک مذہب کی دو قسمیں ہیں ایک غیر منظم مذہب دوسرا منظم مذہب۔ غیر منظم مذہب

سے ہندو دھرم مراد ہے جس کی تعریف سابقہ اوراق میں خود پنڈت جی کی زبانی پیش کی جا چکی ہے کہ ہندو مت پراگندہ اور متضاد خیالات ورسوم کا نام ہے۔ اس میں کسی قسم کی تنظیم نہیں پائی جاتی نہ اعتقادات معین ہیں نہ عملیات مقرر۔ ہر اعتقاد اور عمل کا آدمی اس میں کھپ جاتا ہے بشرطیکہ وہ کسی ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہو اور یہی مذہب پنڈت جی کا محبوب مذہب ہے وہ اس کی متضاد اداؤں سے والہانہ محبت رکھتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر دنیا کے سامنے اس کے حسن و جمال کی تبلیغ کا فرض بھی پورا کرتے ہیں۔

منظم مذہب کے تحت میں خصوصیت کے ساتھ اسلام کو جگہ دی گئی ہے اور یہی وہ مذہب ہے جس کے خلاف پنڈت جی شمشیر بکف نظر آتے ہیں، اب ذرا مذہب کے خلاف پنڈت جی کے ارشادات کو ملاحظہ کیجئے اور فیصلہ کر لیجئے کہ دشمنی مطلق مذہب سے ہے یا صرف اسلام سے۔

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اُسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ تقریباً ہمیشہ یہ معلوم

ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا۔ توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل اعزاض رکھنے والوں کی بقا کا حمایتی ہے میری کہانی صلا۱۶ جلد دوم۔

ھے آپ جنگ آزادی کا جرنیل جس مذہب کے دبدبے سے لرزہ براندام ہے جس کو قطعاً مٹا دینے کی آرزو کر رہا ہے جو اُسے توہم پرستی تعصب ترقی دشمنی وغیرہ معائب کا پیکر نظر آ رہا ہے وہ مذہب اپنی ہیبتناک شکل و صورت سے صرف ہندوستان میں ہی پنڈت جی کے دل و دماغ کو آماجگاہ خوف و ہراس نہیں بناتا بلکہ دوسرے ممالک میں بھی سکون و اطمینان کی سانس نہیں لینے دیتا۔ ظاہر ہے کہ اس شان وشوکت کا مذہب ہندو دھرم تو نہیں سکتا اس لئے کہ یہ بیچارہ تو کبھی سمندر پار کی دنیا سے روشناس نہیں ہوا اس کے ماننے والوں نے اس کو صرف ہندوستان کی چار دیواری میں محدود رکھنا ہی بہتر خیال کیا۔ اگر دلدادگان ہندو دھرم میں سے دو افراد بیرون ہند نظر بھی آجائیں تو یہ خاک ہند کے ہی ذرے ہوں گے جو سائنس کی روشنی نے ان کو جذب کر لیا ہوگا۔ ورنہ بحیثیت مذہب ہندو دھرم صرف بھارت ماتا میں ہی پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ دھرم پراگندہ و منتشر ہے اس سے پنڈت جی کو کیا ڈر خوف تو اس مذہب سے

ہے جو بحیثیت مذہب چار دانگ عالم میں موجود ہے اور طرہ یہ کہ منظم ہے اور ہر طرح منظم ہے۔ بیشک یہ مذہب پنڈت جی اور ان کی کمپنی کے دیگر کارکنوں کی پریشانی۔ تخریبیت زندگی کا سامان مہیا کر دیتا ہے

یہ منظم مذہب جو بیرون ہند بھی دنیا کے انسانیت پر قابض ہیں دو ہی ہو سکتے ہیں۔ اسلام اور عیسائیت۔ اور پنڈت جی نے بھی میری کہانی کے صفحہ ۱۶۳ پر انہیں دونوں کو منظم مذہب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے مگر پنڈت جی کو عیسائیت سے کچھ زیادہ خطرہ نہیں ہے اسی لئے بس دو ایک صفحے نذر عیسائیت کئے ہیں ہاں اسلام نے راشٹر پتی کے لئے نواب و خور حرام کر رکھا ہے اس لئے جس رنگ میں بھی ممکن ہو سکا اسلام کے خلاف دل کھول کے گل افشانی فرمائی ہے۔ اس کے تمدن اس کی معاشرت اس کی تہذیب اس کے اعتقادات کو فراخ دلی کے ساتھ بے معنی فضول اور غلامی کی زنجیر ایسے دلپسند لقب عطا فرمائے ہیں۔

عیسائیت اور اسلام میں یہ امتیاز بھی لاوجہ نہیں ہے بلکہ اس کے قوی اسباب ہیں اور پنڈت جی کو ان کا احساس ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ اگرچہ عیسائی ازم فی الجملہ تنظیم رکھتا تھا مگر اس کے دن پورے ہو چکے ہیں اور وہ دم توڑ رہا ہے، یورپ جو کبھی اس کا محکوم تھا اب رسیاں توڑا رہا ہے۔ اس لئے کہ کشمکش حیات سے عہدہ برآ ہونے کے

ہے جن حقائق عالیہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔عیسائیت ان سے تہی دامن ہے ۔سائنس کا دن دو نا رات چوگنا عروج زمانہ بے مائگی کو اور فاش کر رہا ہے اسی وجہ سے یورپ عیسائیت سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے پھر جب یورپ میں جو اس کا مرکز تھا یہ عالم ہو تو دوسرے ممالک کا حال ظاہر ہی ہے۔

رہا ہندوستان تو یہاں پنڈت جی کو عیسائیت سے کوئی ہراس نہیں اس لئے کہ بھارت ورش میں جو لوگ عیسائی ہوئے ہیں وہ زیادہ تر پست اقوام میں سے ہیں۔ اور صرف اس لئے عیسائی ہو گئے ہیں کہ یہ حکومت کا مذہب ہے اس کے سہارے ان کو انسانیت کے تھوڑے بہت حقوق مل جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہوا بھی ایک پست قوم کا فرد جس کا سایہ بھی پنڈت صاحبان کے لئے باعث نجاست تھا ہاتھ ملانے کے قابل ہو گیا بھارت ماتا میں عیسائی ازم کو باعث نجات اخروی یقین کر کے شاید ہی کسی نے قبول کیا ہو ہم نے جہاں تک بھی سمجھنے کی کوشش کی یہی معلوم ہوا کہ اچھوت اقوام حیوانیت کے سلوک، کی تاب نہ لا کر شاہی پرچم کے سایے میں پناہ گزیں ہو گئیں، اب اگر ان کو ان کے اصل مذہب میں انسانیت کے معمولی حقوق بھی مل جائیں تو وہ آسانی سے پھر ہندو ہو جائیں گے۔ اسی بنیاد پر اچھوت ادھار اور شدھی کا پروپیگنڈا شروع کر

دیا گیا ہے۔ لہٰذا کیا ضرورت ہے کہ پنڈت جی عیسائیت کی صورت دیکھ کر پریشان ہوں۔ انگریز کا پنجہ کمزور ہوتے ہی ہندوستان میں عیسائیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پنڈت جی کے عیسائیت سے عدم خوف کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ ہندومت اور عیسائی ازم میں فی الجملہ یگانگت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے جس طرح آریوں کے نزدیک تین قدیم ہیں۔ روح، مادہ اور پرمیشور اسی طرح عیسائی بھی باپ بیٹے اور روح القدس کو قدیم مانتے ہیں۔ یعنی انکار توحید میں دونوں ہم آوا ہیں (دوسرے ہندو فرقوں کا منکر توحید ہونا تو اظہر من الشمس ہے) عبادت کے طریقوں میں بھی یکرنگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے عیسائیوں کو ہندو دھرم میں شامل کرنے کے لیے کسی خاص وقت کا سامنا نہ ہوگا۔ سوراج کے ملتے ہی یہ مشکل خود بخود حل ہو جائے گی اور سارے ہندوستانی عیسائی ہندو۔

پنڈت جی اسلام سے کیوں خائف ہیں

گو مسلمان مٹ چکا ہے اور اس کی دولت وثروت لٹ چکی ہے۔ صنعت، حرفت اور تجارت سے ہاتھ دھو چکا ہے مگر پھر بھی اس کی شان وشوکت میں کمی نہیں آئی اس کے ہر انداز میں ایک رعب ہے۔ ہر ادا میں ایک ہیبت ہے وہ سکرات کے عالم میں بھی زندہ دل ہے اور دوسری قوموں کو حیات

بخشی کی استعداد رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس توحید کا خزانہ ہے مساوات کی دولت ہے تنظیم کا لشکر ہے، اخلاق فاضلہ کی فوج ہے وغیرہ وغیرہ اور ان میں اتنا جذب اور کشش کہ آج بھی صالح فطرت انسانوں کے گروہ اس کے پرچم کے سایہ میں ہر طرح کا امن وسکون پاتے ہیں جو اس مذہب سے وابستہ ہو جاتا ہے وہ دوسری طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا اور جو بھی اس کے حقیقی خط وخال کو دیکھ پاتا ہے اس کو کہیں اور دلچسپی کا سامان نہیں ملتا۔ اسلام کے مقناطیسی جذب کا تذکرہ دوسروں کی زبان سے سنیئے۔

جو بات کہ مسلمان بادشاہ مسلمانی سلطنت کے ہوتے ہوئے بھی نہ کر سکے آج وہ مسلمانی راجیہ کے نہ ہوتے ہوئے بھی پوری ہو رہی ہے ہر روز ہندو دھرم کو عورت و مرد چھوڑ کر مسلمان یا عیسائی ہو رہے ہیں، مسلمان تو دینے کی بجائے لے ہی رہے ہیں اور ہندو لینے کی بجائے دے ہی رہے ہیں، اس صورت میں ہندوؤں کا زوال اور مسلمانوں کا عروج کیوں نہ ہو۔ اخبار پرتاپ کرشن نمبر ۲۰ اگست ۲۷ء

اسی قسم کے ہولناک مناظر ہی تو پنڈت جی کے پیٹ میں پانی پیدا کئے دے رہے ہیں اور وہ مجبور ہو لئے جاتے ہیں کہ کسی طرح اسلامی سیلاب

کی طوفان خیزیوں کو روکا جائے اور ہو سکے تو اسے یکسر مٹا دیا جائے

پنڈت جی کی ایک چالاکی

پنڈت جی خوب جانتے ہیں کہ اگر بلا تمہید ہی اسلامی تعلیمات پر بے معنی اعتراضات کی بھرمار شروع کر دی تو دیانند جی مہاراج۔ بال گنگادھر تلک اور لالہ لاجپت رائے کی طرح اسلام نوازی کا راز افشا ہو جائے گا اور بیس سے تیس مسلمان بھی برافروختہ ہوں اسی لئے منزل مقصود کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھایا جا رہا ہے۔ پہلے تو منظم مذہب کو برا بھلا کہا اور جب چہروں پر نظر ڈال کے دیکھ لیا کہ سننے والوں کے دلوں میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا نہیں ہوئے اور سب نے زہر کے گھونٹ شربت کی طرح نوش جان کر لئے تو نہایت بھولے پن سے ارشاد کر دیا کہ وہ منظم مذہب جس کے معائب و نقائص بتلائے گئے ہیں اسلام اور عیسائیت ہیں۔ لیکن کچھ دیر کے بعد عیسائیت کو بھی بھول گئے اور صرف عداوتِ اسلام مقصد حیات بن کر رہ گئی مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ پنڈت جی اسلام پر حملہ تو ہر چہار جانب سے کرتے ہیں مگر رام جانے کیوں اسلام کا لفظ زبان تک ذرا احتیاطی رنگ میں لاتے ہیں مسلم تمدن مسلم تہذیب منظم مذہب وغیرہ لفظوں کی آڑ لیکر دل کا غبار نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ کچھ کہہ ڈالتے ہیں جو ایک کٹر سے کٹر مہاسبھائی بھی کہنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔

اسلام تنگ نظری سکھاتا ہے	ہر معاملے میں مسلمانوں کی فراخ حوصلگی ضرب المثل ہے اور دنیا کی ہر سمجھدار قوم نے اہل اسلام کے

اس وصف عالی کی تعریف و توصیف کی ہے قرآن کریم لا اکراہ فی الدین وغیرہ کا اعلان کر کے اہل عقل و فہم کو آزادی رائے حریت فکر و نظر صلح و آشتی امن و امان کی تعلیم دے رہا ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ پوجیہ پنڈت کو آفتاب عالمتاب ظلمت پاش معلوم ہو رہا ہے اور دن کے نورانی دامن میں تاریکی نظر آ رہی ہے اور وہ بے باکی کے ساتھ اسلام کو تنگ نظری کا معلم کہہ رہے ہیں۔

خصوصاً مسلمانوں سے مذہب کے معاملے میں گفتگو کرنا غالباً دشوار تر ہے اس لئے کہ ان کے مذہب میں آزادی رائے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ جہانتک عقیدے کا تعلق ہے ان کا تو ایک سیدھا اور تنگ راستہ ہے جس سے مومن کو بال بھر بھی ادھر اُدھر نہیں ہٹنا چاہیئے۔ میری کہانی صفحہ ۲ ج اول۔

دیکھا آپ نے کس خوبصورتی سے اسلام کی عملی اور اعتقادی تعلیمات کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ رہنمائے سیاست ہند کا مطلب یہ ہے کہ اسلام من مانی کارروائیوں کی اجازت نہیں دیتا۔ دہریت و اشتراکیت کے جراثیم کو ابھرتے ہی آغوش عدم کی زینت بنا دیتا ہے دوسروں کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ

کی شدید مخالفت کرتا ہے موجودہ معاشرت کے لوازمات شراب جوۓ
سائنٹفک قماربازی اور آزادانہ جنسی تعلقات کو ایک آنکھ نہیں د
سکتا۔ سول میرج (قانونی زناکاری) اور بے پردگی کی مخالفت کرتا ہے
اس لیئے یہ مذہب تنگ نظری سکھاتا ہے اور حریت فکر و نظر پہ پہرے
بٹھاتا ہے لہٰذا اگر آزادی رائے چاہتے ہو تو اسلام کو چھوڑ دو اور اگر
اس روشنی کے زمانے میں بھی تم اس دقیانوسی مذہب سے وابستہ رہے تو
تنگ نظر تمہارا لقب ہوگا اور جدید تہذیب کے چیلے تم کو ذلیل نگاہوں
سے دیکھیں گے۔

مسلم قومیت کا تصور بھی لغو اور مہمل ہے

یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان مستقل
قوم کی حیثیت سے آباد ہیں اور ان کی یہ
حیثیت اس وقت تک باقی رہے گی۔ جب تک کہ مسلمان کہلاتے رہیں
گے۔ مگر پنڈت جی کہتے ہیں کہ مسلم قومیت اور ملت اسلامیہ کی بقاء اور حیات
کا تو ذکر کیا اس کا تصور تک لغو مہمل اور دور از کار ہے۔

ہندو اور مسلم تمدن اور ملت اسلامی ان الفاظ سے ماضی کے
کیسے کیسے دل پسند تاریخی واقعات اور موجودہ اور آئندہ کے
متعلق کیسی کیسی امیدوں کے باب کھل جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان
میں مسلم قومیت پہ زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہی کہ ایک

قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے۔ جو یکجا نہیں ہے منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے اب سیاسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطہ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جاسکتا ہے۔ میری کہانی ص۳۳۱ جلد دوم۔

ان ارشادات کے شروع میں ہندو کا لفظ رکھ کر ایک پردہ فریب تیار کیا گیا ہے تاکہ ناظر کو یہ دھوکا ہو جائے کہ پنڈت جی ہندو دھرم پہ بھی کچھ عنایت فرمانا چاہتے ہیں لیکن سارا زور قلم محض اسلام ہی کے خلاف صرف ہوا ہے اور ہندوازم کے متعلق ایک بات بھی ارشاد نہیں ہوئی اور یہ چالاکی جہاں تک ہم سمجھے ہیں۔ اس لئے کیگئی ہے کہ اگر کوئی سرپھرا مسلمان بگڑ کھڑا ہو تو فوراً بیان کی تاویل کر لی جائے اور یہ ترکیب پنڈت جی کی نیت کے پس منظر کو اچھی طرح روشن کر رہی ہے۔ ان تو ان گرامی ارشادات کا مطلب کیا ہے یہی نا کہ ملت اسلامیہ اور مسلم قومیت قصر ماضی کے نقش و نگار تھے۔ حال اور استقبال میں ان کا ذکر بھی بے نتیجہ ہے، جس طرح زمانے کے انقلابات نے ماضی کی اور یادگاروں کو مٹا دیا اسلامی قومیت کے ایوان کو بھی مسمار کر دیا۔ موجودہ اور آئندہ دور میں باعث تسکین قلب امیدوں کی پیدائش کے سوا ملت اسلامیہ کے تصور

کا اور کوئی فائدہ نہیں ہے اور خاص کر ہندوستان میں جو ملک ہے جہاں پراچین تہذیب اور رام راج کا جھنڈا بلند کرنے کی سعی مسلسل کی جا رہی ہے۔ مسلم قومیت کا ذکر دیوانگی کا اعلان کرنا ہے اور اگر یہ قصہ پارینہ بیان کرنا ہی ہے تو عرب ایران اور ترکی وغیرہ ممالک اسلامیہ میں شاید کچھ اچھا معلوم ہو بھلا ہندوستان میں ایسی بے معنی باتوں کا کون سا محل ہے آخر ایک منتشر مبہم غیر متعین قوم کو جداگانہ رنگ میں دیکھتے کیوں ہو۔ اس کو اکثریت کا ایک جزو سمجھو اور بس ورنہ عالم سیاسیات میں تم لغویت کا شکار سمجھے جاؤ گے اور دنیائے معاشیات میں دور از کار لایعنی امور میں گرفتار لہذا اگر چاہتے ہو کہ سیاسی اعتبار سے تم کو کوئی وقار حاصل ہو اور معاشی حیثیت سے تمہاری ہستی برقرار رہے تو ملت اسلامیہ مسلم قومیت کا تصور بھی نہ کرو اور ٹھنڈے ٹھنڈے لقمۂ اکثریت ہو جاؤ۔

آخری جملوں میں جو زریں قسم کا دام فریب پنہاں ہے بہت سے ذی علم مسلمان بھی اس میں گرفتار ہو گئے اور صرف اس خوف سے کہ کہیں پنڈت جی اور ان کے ایجنٹ ملت اسلامیہ اور مسلم قومیت کا نام زبان پر لانے سے ہم کو لغویت پرست کا خطاب نہ دیدیں سیاسی طور پر شدھ ہو گئے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور پنڈت جی وہ کام حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں جو شردھانند اور دیانند جی کی جلد بازی یا پنجۂ مرگ میں گرفتاری کی وجہ سے عملی صورت نہ پا سکا تھا۔

مسلم قومیت کا تخیل ازمنہ وسطیٰ کی طرف رجعت ہے

ازمنہ وسطیٰ اس دور کا نام ہے جس میں انسانیت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی انسانوں کے لباس میں بھیڑیے بستے تھے۔ ایک قوم دوسری قوم کو قتل و غارت کرنا اپنا فریضہ سمجھتی تھی۔ گناہ اعمال خیر کہلاتے تھے۔ ظلم و جور کا لقب عدل و انصاف تھا۔ صنف نازک کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا غرضیکہ وہ زمانہ ہر حیثیت سے حیوانیت اور بہیمیت خباثت اور فرعونیت کے عروج کا زمانہ تھا۔ پنڈت جی کہتے ہیں کہ مسلم قومیت کا تخیل اسی انسانیت سوز دور کو واپس لاتا ہے۔

بہرکیف اس ذہنیت کے سمجھنے میں اس سے تھوڑی مدد ملے گی۔ جو اس کے پیچھے کام کر رہی ہے اس قسم کی چند قوموں کا وجود عہد وسطیٰ اور اس کے بعد بھی پایا جاتا ہے۔ جو ایک دوسرے سے علیٰحدہ تھیں اور گھل مل نہ سکتی تھیں۔

سلاطین عثمانی کے ابتدائی عہد کے قسطنطنیہ میں اس قسم کی ہر قوم علیحدہ علیحدہ وجود رکھتی تھی اور اس کو کسی حد تک خود مختاری حاصل تھی۔ مثلاً لاطینی عیسائی۔ ارتھوڈاکس عیسائی اور یہودی وغیرہ یہ گویا ابتدا تھی۔ اپنے وطن کے علاوہ دیگر ممالک سے رشتہ اخوت جوڑنے کی جو اس زمانے میں اکثر

مشرقی ممالک کے لیے ایک بہت ہی پریشان کن خواب بن گیا ہے اس لیے مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں صرف مذہبی اخوت کا رشتہ ایک چیز ہے اور اس لئے کوئی قوم جدید مفہوم میں ترقی نہ کرنے پائے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید تہذیب وتمدن کو ترک کرکے ہم لوگ عہد وسطیٰ کے طریقوں کو پھر اختیار کرلیں یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنا چاہیئے یا بدیسی حکومت اور آخر میں تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ ذہن کی ایک جذباتی کیفیت ہے اور محسوس یا غیر محسوس طریقہ پر یہ خواہش کہ حقائق سے بالخصوص معاشی حقائق سے کسی طرح دوچار ہونا نہ پڑے۔ میری کہانی صفحہ ۴۳ جلد دوم۔

اس بیان میں پنڈت جی نے اپنی سیاست دانی کا پورا کمال صرف کردیا ہے اور دیا نندجی کی روح کے لیے سامان رقص مسرت مہیا فرمادیا ہے وہ مسلمانوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو تم جو مسلم قومیت کا راگ الاپتے رہتے ہو تو یہ زمانہ جاہلیت کا طور طریقہ ہے۔ مہذب دنیا میں اس کی کہیں گنجائش نہیں اس زمانے میں مذہبی اخوت کا نام نہ لینا چاہیے یہ کیا مکہ مدینہ کا ذکر کرتے رہتے ہو ایران ترکستان کے خیال میں پڑے رہتے ہو یہ سب ازمنہ وسطیٰ کے انداز ہیں اگر جدید

مفہوم میں ترقی کرنا چاہتے ہو تو بھارت ماتا کی پرستش کرو۔ بردوار اور متھرا جی سے دل بہلاؤ اور غور کرو اسلامی قومیت کا تصور خود اسلامی ممالک کے لئے پریشان کن خواب بنا ہوا ہے جس کی تعبیر ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر تم کیوں ایسے دور از کار تخیل میں گرفتار ہو۔ دیکھو اگر تم اسلامی اخوت اور مسلم قومیت کا نام بھی لوگے تو یہ سمجھا جائے گا کہ تم یا تو ہندوستان میں مطلق العنان حکومت رکھنا چاہتے ہو یا انگریزوں کی غلامی میں زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہو ورنہ اگر آزادی چاہتے ہو۔ اور بدیسی حکومت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکنے کا خیال ہے تو پہلے مسلم قومیت کے تصور سے آزاد ہو جاؤ اور مذہبی اخوت کی زنجیر سے خلاصی حاصل کرو اور سیاسی ہی نہیں بلکہ مذہبی شدھی کا فخر حاصل کر کے مہاشے جی کا معزز لقب حاصل کرو اور انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے سے پہلے اسلام سے آزاد ہو کر متحدہ قومیت کی تعمیر میں کام آؤ اور اگر یہ باتیں تمہیں قبول نہیں ہیں تو تم سامراج پرست ہو رجعت پسند ہو آزادی دشمن ہو وغیرہ وغیرہ اور ہاں ایک بات اور سنو کہ اسلامی قومیت جس کے لئے تم جان جوکھوں میں ڈال رہے ہو۔ حقیقت میں کوئی چیز ہی نہیں صرف ذہن کی جذباتی کیفیت یعنی قوت واہمہ کی ایجاد ہے۔ ذرا ہوش وخرد سے کام لو یہ طلسم خود بخود ٹوٹ جائے گا اور اگر اس میں ذرا سی بھی صلیت وواقعیت ہوتی تو تم کچھ نہ کچھ حقائق عالم سے باخبر ہوتے تمہاری

حقائق خاص کر معاشی حقائق سے بے خبری بتلاتی ہے کہ تم وہم کے مریض ہو اور تمہاری مسلم قومیت خلاقی واہمہ کا کرشمہ ہے لہٰذا اے مسلمانو! اگر چاہتے ہو تم کہ ہو جاؤ باخبر حقائق سے اور چھوٹ جاؤ قوت واہمہ کے چنگل سے تو ہو جاؤ برضا و رغبت شدھ اور ذرا نہ کرو چون و چرا اس لئے کہ مفہوم حقیقی وطن دوستی اور قوم پرستی کا یہی ہے۔ درمیان ہماری سیاسی ڈکشنری کے۔

مسلم قومیت کا تخیل محض اخباری پروپیگنڈا ہے

پنڈت جی مسلم قومیت کو عہد وسطیٰ کی طرف رجعت کہہ چکے قوت واہمہ کی خلاقی کا نمونہ فرما چکے سامراج پرستی اور بدیسی حکومت کے دوام کا ذریعہ قرار دے چکے مگر ابھی اچھی طرح دل کے پھپھولے نہیں پھوٹے، دماغ کے ترکش میں ایک آدھ تیر کیوں رہ جائے اس لئے پھر ارشاد ہوتا ہے۔

> مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد بھی ہوتا تو بھی حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔ میری کہانی ص۳۲۲ جلد دوم۔

اس بیان کے الفاظ کہہ رہے ہیں کہ پنڈت جی نے مسلم قومیت کے قوت واہمہ کی عنایت کا شاخسانہ قرار دینے کے بعد کچھ غور و فکر کی تکلیف فرمائی

اب جو عقل کی آنکھ کھول کر دیکھا تو ہندوستان کے طول و عرض میں پونے دس کروڑ مسلمان نظر آئے اور ان میں مسلم قومیت اسلامی اخوت کی بسی بھری اور ایک منظم و مکمل تہذیب کے آثار دکھائی دیے اس لیے دفع دخل مقدر کے طور پر فرماتے ہیں کہ سنو اسلامی قومیت کے متوالو یہ تمہاری قومیت ہے۔ تو اصل میں وہم کی پیداوار اور چند لوگوں کی من گھڑت کہانی لیکن تم جو اس کے آثار و اظلال خارج میں موجود پاتے ہو تو یہ محض اخبارات کا پروپیگنڈا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ اخبار سوئی کا پھالا اور رائی کا پہاڑ بنانے میں کتنے مشاق ہوتے ہیں لہٰذا نہ پھنسو اس اخباری پروپیگنڈے میں اور چھوڑو اس ناکارہ خیال کو۔

اس فرمان میں پنڈت جی نے اپنے چیلوں کو یہ لطیف ہدایت بھی فرمائی ہے کہ مسلم اخبارات کا گلا گھونٹے بغیر متحدہ قومیت کی تعمیر مشکل ہے اس لیے کہ آج کل تو یہی مسلم قومیت کی رٹ لگا رہے ہیں چنانچہ سنا گیا ہے کہ ہمارے صوبے میں اس ہدایت پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے کانگرسی حکومت کی طرف سے ایک سرکلر جاری ہوا ہے جس کے ذریعے حکومت سے متعلق اداروں میں ایسے اخبارات کی خریداری ممنوع قرار دیدی گئی ہے جو مسلم قومیت اور اسلامی تہذیب کی حمایت کرتے ہیں۔ پریس ایکٹ بھی بیکار نہیں ہے اس کی دفعات بھی مسلم اخبارات پر کافی سے

زیادہ استعمال ہو رہی ہیں۔

مسلم تمدن ایک معمہ ہے | مسلم تمدن کے وجود اور آثار وجود سے ہر بابصیرت انسان آگاہ ہے لیکن پنڈت جی اس کو ایک معمہ خیال کرتے ہیں اور یہ کچھ بیجا بھی نہیں ہے اس لئے کہ جب مسلم قومیت کو قوت واہمہ کی کارستانی سمجھ لیا گیا تو مسلم تمدن معمہ نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا انسان جس قسم کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس پر اسی طرز کی عمارت بنانا پڑتی ہے اسی وجہ سے پنڈت جی اپنے فریب خیال کو قابل قبول بنانے کے لئے نئے نئے انداز اختیار کر رہے ہیں۔

لیکن یہ مسلم تمدن ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں ایرانیوں اور ترکیوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے ابتک باقی ہے یا اس کا مطلب زبان آرٹ موسیقی اور رسم و روایات ہیں مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا کبھی ذکر کرتا ہو۔ میری کہانی صـ۳۳۳ جلد دوم۔

سپہ سالار اعظم حزب حریت کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی تمدن کا معین مفہوم تک نہیں ہے اس لئے اس کے وجود اور بقائے وجود کا سوال ہی بیکار رہے۔

اسلامی تمدن ناقابل فہم چیستان ہے | عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی

مدن کے آثار اتنے روشن ہیں کہ محتاج ثبوت نہیں کجا کہ اس کے ادراک میں شک وشبہ۔ مگر پنڈت صاحب اپنے علم وفضل کے باوجود اس پہیلی کو نہیں بوجھ سکے۔

میں نے اسلامی تمدن کو سمجھنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہیں ہوا۔

میری کہانی ص۳۲ جلد دوم

مسلمانوں کو یہ درس دیا جارہا ہے کہ دیکھو مجھ ایسا جہاندیدہ تجربہ کار جدید علوم سے زیور سے آراستہ ماہر سیاست آدمی اسلامی تمدن کا ادراک باوجود جدوجہد نہ کرسکا تو پھر تم اس کو کیا سمجھو گے اور جب یہ ناقابل فہم چیستان ہے تو اس کا تذکرہ ہی فضول اور اس کا نام لینا بھی عقل وتدبر کے منافی ہے۔

ابھی تک تو یہ ارشاد ہورہا تھا کہ اسلامی تمدن کا مفہوم عقل وفہم کی گرفت سے باہر ہے | اسلامی تمدن نام ہے ٹونٹی دار لوٹے وغیرہ کا

مگر اب سیاست دانی کے جوہر نئے انداز میں دکھائے جاتے ہیں اور مسلمانوں کے سامنے معمولی امتیازات کو اسلامی تمدن کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔

اگر عوام الناس پر نظر ڈالی جائے تو اسلامی تمدن کی نشانی بظاہر یہ ہے کہ ایک خاص قسم کا پاجامہ جو نہ زیادہ لمبا ہو نہ

زیادہ اونچا ایک خاص طریقے سے مونچھوں کی تراش خراش اور داڑھی کا رکھنا اور ایک خاص قسم کا لوٹا جس میں ٹونٹی ہوتی ہے بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں یعنی دھوتی باندھنا۔ سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا یہ امتیازات بھی دراصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جاتے ہیں ہندو مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں مشکل ہی سے فرق کیا جاسکتا ہے تعلیمیافتہ مسلمان شاید ہی ڈاڑھی رکھتے ہیں علی گڑھ والے البتہ سرخ ترکی ٹوپی کے گرویدہ ہیں (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا) مسلمان عورتیں ساڑھی پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردے سے باہر نکل رہی ہیں۔

میری کہانی صفحہ ۳۰۳ جلد دوم

حقیقت یہ ہے کہ پنڈت جی نے اسلامی تمدن و تہذیب پر تبصرہ کرنے میں اپنے تدبر کی ہر طاقت صرف کر ڈالی ہے تاکہ اگر ایک داؤ خالی جائے تو دوسرے پیچ میں آکر مسلمان چاروں شانے چت گرے اور گرنے کی آواز بھی محسوس نہ ہو۔ اسی نکتہ کے پیش نظر اول تو اسلامی تمدن کے وجود ہی سے انکار فرمایا۔ اس کے بعد یہ دیکھ کر کہ خارج میں تو اس کا وجود پایا

نا ہے سنہری تاروں والے جال کا پتہ لگ جائیگا۔ لہٰذا ارشاد ہوا
اصل تو کوئی وجود تھا نہیں مگر قوت واہمہ نے ایک پیکر تیار کردیا اور
مات نے اس کو چمکا دیا اور اگر یہ من گھڑت افسانہ نہ ہوتا تو میری
یں کیوں نہ آتا اور اگر تم مانتے ہی نہیں ہو اور اسلامی تمدن کا
د فرض ہی کئے لیتے ہو تو وہ چند رسمی امتیازات کا نام ہے اور یہ
زات بھی کاشتکاروں اور مزدوروں میں نہیں ہیں بلکہ صرف شہروں
خال خال پائے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی ان کو قیام نہیں ہے بلکہ
رمٹتے جا رہے ہیں۔ دیکھو نا ڈاڑھی منڈا نا فیشن میں داخل ہو گیا
ٹوپی بھی دم توڑ رہی ہے۔ جہاں اس کا وطن وہیں کے لوگوں نے
نکال باہر کیا تو تم اس خارج البلد کو کیوں سر چڑھاتے ہو اور
تو کرو۔ مرد تو رہے در کنار مسلم عورتیں بھی شدھی کی طرف بخوشی بڑھ
ہیں۔ ساڑیاں زیب جسم ہوتے لگیں پردہ جسم کی جگہ عقل پر شمکن ہونے
تو پھر تم کس چیز کا رونا رو رہے ہو یہ امتیازات مٹتے رہے ہیں مٹتے رہیں
ا اور کوئی تو تمہارا تمدن تھا نہیں یہی امتیازات کائنات تمدن تھے
ر وہ فنا ہو رہے ہیں تو تم بھی مرے پہ سو دُرّے والا عمل کرو اور فرقہ پرستی
لعنت سے الگ ہو کر شدھی کی رسم ادا کراؤ اور پکے قوم پرست بن جاؤ۔
کچھ آپ پنڈت جی کہتے ہیں کہ اگر تمہارے نزدیک اسلامی تمدن کا

کچھ وجود تھا بھی تو وہ ابدی نیند کی تیاری کر رہا ہے۔ اُسے چالیس قدم پہونچا آؤ۔ اسی مطلب کو قوی کرنے کے لئے کچھ اور بھی فرماتے ہیں۔

مسلم تمدن مائل یقیناً ہے اور اسلام موت کے گھاٹ اتر رہا ہے

اس زمانے میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہونچے ہیں اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مرد غازی ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لئے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے جو اس کو مذہب سے دور ہی لئے جا رہے ہیں۔ مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے یہی حال عربی ممالک کا ہے۔ سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیا کے لئے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرضیکہ ہر جگہ مذہب پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے

میری کہانی صـ۳۲۶ جلد دوم۔

پنڈت جی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اب اسلام کا زوال شروع ہو گیا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی ترقی کے لئے جو ارمان اور امیدیں تھیں وہ غیر ہندوستانی مسلمانوں کے ہاتھوں برباد ہو گئیں۔ ہر

"سلامی ملک اسلام کے بندھن کھول رہا ہے۔ ایران، عرب، مصر، ترکی سب کے سب مذہب کو منافی عروج و ارتقا سمجھ کر اس کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ لہٰذا اے ہندوستانی مسلمانوں بالو کی دیوار کے پاس نہ جاؤ اور دھارا رنگ اختیار کرو پھر دیکھو کیسی ترقی کرتے ہو اور اگر اسلام کا دامن تمہارے ہاتھ میں رہا تو تم ذلیل و رسوا ہی ہوتے جاؤ گے ہاں عزت کے خواہاں ہو تو ممالک اسلامیہ کی طرح تم کو بھی شرک و کفر کی طرف رجوع ہونا ہو گا۔

بہر صورت پنڈت جی کا منشا یہ ہے کہ مسلمان کی دولت ایمان کو ٹ لیا جائے اور اس کی نظر میں گوہر عرفان کو متاع کاسد بنا دیا ئے خواہ انصاف و عقل کتنی ہی فریاد و فغاں کیوں نہ کریں۔

سلم قوم کو تباہ کرنیکے سطے انوکھی تدبیر

مسلمان تقریباً سات سو برس تک سرزمین ہند پر شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرتا مگر اس کی سادہ لوحی اس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور انگریزوں نے مکاری اور عیاری کے بل بوتے پر اس کو نہ صرف تاج و لت سے محروم کر دیا۔ بلکہ ہر اعتبار سے تباہ و برباد کرنے کی انتھک وشش کی جو کبھی اپنے ادنیٰ خادموں کو ذرا ذرا سی بات پر بڑی بڑی امدادیں بخش دینا معمولی بات خیال کرتا تھا اس کو معاشی مصائب

میں اس حد تک مبتلا کیا کہ وہ دو دو دانوں کو محتاج ہو گیا۔ جو غیروں
زیور علم سے آراستہ کر دیتا تھا۔ اس پر تعلیم کے دروازے بند کر کے بر طر
جاہل بنا دینے کی تدبیریں کیں غرضکہ یورپ کے بنیوں نے مسلمانوں کو ا
طرح کچلا کہ اغیار تک اس کی حالت دیکھ کر افسردہ ہو گئے اور دشمنوں
آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن مسلمان اس زبوں حالی میں بھی اپنی حکو
اور سلطنت پھر حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا رہا۔ دراصل اس
غیرت گوارہ نہ کرتی تھی کہ جس ملک پر اس کے آباء حکمراں تھے۔ اسی وجہ
میں وہ غلامانہ زندگی بسر کرے۔ ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ دنیا
آج تک یاد ہے۔ یہ مسلمان کی حریت پسند فطرت کی ایک جراءت آمو
کروٹ تھی اور اس کے بعد بھی مسلمان چین سے نہیں بیٹھا بلکہ جس طر
بھی ہو سکا زمین ہند سے انگریز کے قدم اکھاڑنے کی فکر و تدبیر کرتا ر
آج بھی وہ غلامی کا قلادہ توڑ دینے کے لئے تیار ہے اسی لئے وہ ہر
ایسے پروگرام کا خیر مقدم کرتا ہے جس میں آزادی ہند کے لئے کوئی
تدبیر ہو وہ اتنا حریت پسند ہے کہ اس کے لئے کسی قربانی سے گریز نہیں
کرتا۔ قید و بند قتل و غارت کی زحمتیں خندہ پیشانی کے ساتھ گوارہ کر
لیتا ہے۔ خود پنڈت جواہر لعل مسلمان کے نہ مٹنے والے جوش آزادی
کے قائل ہیں۔ اور اقراری ہیں کہ مسلمان نے ہر موقع پر انگریز کی حکومت

کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کو وہ کیا کرتا کہ برادران وطن جو آج آزادی کے پرستار ہونے کا ادعا کرتے رہتے ہیں آڑے آگئے اور اپنے سفید نام آقاؤں کے پیر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد بمقابلہ ہندوؤں کے مسلمانوں پر برطانیہ کا ہاتھ زیادہ صاف ہوتا رہا مسلمانوں کے دل میں حکومت کی یاد ابھی تازہ تھی اور وہ مقابلتہً ذرا زیادہ جنگجو اور لڑاکو بھی سمجھے جاتے تھے اس لئے حکومت بھی ان کو زیادہ خطرناک سمجھتی تھی مسلمانوں نے جدید تعلیم سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اس لئے سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ کم تھا ان تمام وجوہ سے ان کے متعلق حکومت کو طرح طرح کے شبہات اور خطرات تھے برخلاف اس کے ہندوؤں نے زیادہ شوق سے آگے بڑھ کر انگریزی زبان سیکھی اور کلرکی ملازمتیں حاصل کیں اس لئے حکومت نے بھی اندازہ کرلیا کہ ہندو زیادہ آسانی سے قابو میں آسکتے ہیں۔ میری کہانی ص۲۱۲ جلد دوم

ہم اس سے بحث نہیں کرنا چاہتے کہ برادران وطن نے اسلامی بادشاہوں کی وزارت پر انگریزوں کی کلرکی کو کیوں ترجیح دی۔ ان کو اپنے دل کا اختیار تھا جیسا حاکم چاہا پسند کرلیا۔ ہم تو مسلمان کی حریت پسندی کا جوش دیکھنا

چاہتے ہیں کہ وہ کہاں تک آزادی خواہ ہے ظاہر ہے کہ مسلمان بیتاب ہے۔ مضطرب ہے کہ اپنی اجڑی ہوئی بستی کو بسائے۔ مٹی ہوئی شوکت و وجاہت کو واپس لائے اور ان ہاتھوں کو کچل ڈالے جنھوں نے بہادری سے نہیں بلکہ فریب کاری سے اس کو تخت سے اتار کر تختہ پر لا بٹھایا۔ اس کا جوش آزادی اس کے دل و دماغ پر اس حد تک چھایا ہوا ہے کہ اکثر وہ خود غرضوں کا آلہ کار بنتا رہا ہے اور بہت آسانی سے اب بھی بن جاتا ہے۔ جب وہ راہ حریت پر دوڑتا ہے تو یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس میں اس کو فنا کر دینے کے لئے کچھ کھائیاں اور گڑھے تیار کئے جا چکے ہیں

مسلمانوں کی حریت پسندی کا یہ جوش اور یہ جذبہ پنڈت جی سول نافرمانی کے زمانے میں مشاہدہ کر چکے ہیں اور اچھی طرح جان چکے ہیں کہ مسلمان ہر قیمت پر آزادی حاصل کرنے کے لئے تیار ہے اسی لئے وہ مسلم تمدن مسلم قومیت اور اسلامی تہذیب کے قصر کی اینٹ اینٹ اسی کے ہاتھوں پراگندہ کرا دینے کے لئے اس کے جذبہ آزادی کو ابھارتے ہیں تاکہ وہ انگریزوں کے ظالمانہ طرز حکومت کو خاک ہند سے دور کرنے اور انگریزوں سے ان مظالم کا انتقام لینے کے لئے جو ایام سابقہ میں اس کے ہم شربوں پر روا رکھے گئے نادانستہ اپنا گھر خود برباد کر دے اور اور آپ ہی اپنی تہذیب و تمدن کو گورکنارے پہونچا آئے۔ یعنی پنڈت

جی چاہتے ہیں کہ رقیبوں کے خون سے زمین لالہ زار بھی ہو جائے اور دامن پر داغ نہ آنے پائے اسی حکمت عمل کو بروئے کار لانے کے لیئے ارشاد ہوا ہے۔

ہاں مسلم قوم اور مسلم تمدن کا کیا ہو گا یہ آئندہ صرف شمالی ہند میں سرکار دولتمدار برطانیہ کے زیر سایہ پھلے پھولے گا۔

میری کہانی صفحہ ۳ جلد دوم

پنڈت جی فرما رہے ہیں کہ مسلم قومیت راہ آزادی میں ایک خلیج ہے ناقابل عبور پہلے اسے پاٹ دو اور مسلم تمدن ایک روڑا ہے پاشکن لہٰذا اس کو اٹھا کر پھینک دو تب کہیں حریت کی راہ پر گامزن ہو سکو گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیئے کہ تمہارا مسلمان ہونا ہی منافی جذبہ آزادی ہے جبتک اسلام سے دست بردار نہ ہو جاؤ گے آزادی نصیب نہ ہو سکے گی اور اگر تم نے مسلم قومیت وغیرہ وہی باتوں کا ذکر بھی کیا تو پھر برطانیہ کی حکومت کا پرچم ہندوستان میں لہراتا رہے گا۔ اس لئے کہ اس تخیل کا تو مفہوم یہی ہے کہ انگریز کا دست شفقت سر پر رہے۔ یہ تو پودہ ہی ایسا ہے جو صرف انگریزی راج کے سائے میں پنپ سکتا ہے۔ لہٰذا اگر چاہتے ہو کہ احرار کہلاؤ تو پہلے مسلم تمدن مسلم قومیت بلکہ اسلام کا سر کچل دو۔ اس زہریلے درخت کو بیخ و بن سے اکھاڑ

پھینکو۔ پنڈت جی کی یہ رطب اللسانی عقلا کے نزدیک کتنی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو کیا ساری دنیا میں مسلم تہذیب انگریزی حکومت کے سہارے ہی پھیلی تھی؟ کیا اس زمانے میں ممالک اسلامیہ کے اندر انگریزی ہی کی قوت بازو اسلامیات کو موت سے بچائے ہوئے ہے؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وار پڑا بھرپور۔ ہیٹ سوٹ والوں کا تو ذکر کیا ہے۔ بہت سے عمامے قبا والے بھی جاں بلب ہو گئے اور جو لوگ کل تک ثقافت اسلامی کے محافظ تھے آج اسکو اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہیں اور اغیار کو اس کی بنیاد پر قوت آزمائی کرتے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ لاریب پنڈت جی کی فراست ودانائی قابل داد ہے اور موصوف کی تعریف میں غالب مرحوم کا یہ شعر موزوں ہے

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

خود مسلمانوں سے اسلام کو برباد کرانے کا ایسا لطیف نسخہ کوئی جہا سبھائی کب تجویز کر سکتا تھا اور اگر جرأت بھی کرتا تو مسلمان جسم پہ مہا سبھائی لباس دیکھ کر ہوشیار ہو جاتے مگر پنڈت جی کے بر میں کانگریس یعنی وطنیت اور قومیت کا خلعت ہے ان کو فرقہ پرستی سے کیا واسطہ وہ تو صرف قوم نوازی کی دھن میں مسلمانوں کے تیر وکمان سے اسلام

واسلامیات کا شکار کر رہے ہیں۔

مسلم قومیت کا تخیل ڈنڈے کے زور سے مٹا دیا جائے گا

پنڈت جی جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ابھی ایسی بھی موجود ہے جو کسی قیمت پر بھی متاع ایمان کو فروخت کرنے کے لئے تیار نہ ہوگی. اس لئے وہ اس گروہ سے خطاب فضول سمجھ کر عوام اہل اسلام کو پھانسنے کے لئے مسلم رابطہ عوام کے نام سے ایک اسکیم مرتب کرتے ہیں تاکہ سادہ لوح اور حقائق اسلامیہ سے ناواقف مسلمانوں کو جدید قومیت میں جذب کر لیا جائے اور اس طرح اہل اسلام میں طبقاتی جنگ چھڑ جائے اور شیرازہ اسلام پاش پاش ہو جائے بھائی بھائی کا گلا کاٹے اور کوئی کرب کسی قسم کا جذبہ افسوس محسوس نہ کرے۔ یہ مسلم کش پالیسی خاص پنڈت جی کی ایجاد ہے۔ مگر اس پر عمل مسلمانوں کے ذریعے ہو رہا ہے حتیٰ کہ بعض مولینا صاحبان بھی آلۂ کار بنے ہوئے ہیں بغرضیکہ جب اس اسلام نواز طرز عمل سے مسلم اکثریت پر قابو حاصل کر لیا جائے گا تو باقی ماندہ سو پچاس اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن کے مرثیہ خوانوں کے دل و دماغ کو ڈنڈے کے زور سے درست کر لیا جائے گا اور علم تشدد کے پجاری تشدد پر عمل پیرا ہو کر اہل اسلام کی شدھی کی تکمیل کریں گے

سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ

کا تصفیہ جبر کے سوا اور کسی صورت سے ممکن نہیں اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی۔ میری کہانی ص۴۶۹ جلد دوم۔

اس پروگرام کو عملی صورت میں لانے کے لئے کانگرس میں شعبہ اسلامیات کھول دیا گیا ہے اور جمعیۃ علماء ہند دہلی کا آرگن اس پر فخر بھی کر رہا ہے اس لئے کہ کانگرس مسلمانوں کی اتنی ہمدرد ہے کہ نہ ہندویات نہ سکھیات نہ عیسائیات نہ پارسیات بلکہ صرف اسلامیات پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے بھلا یہ فخر کی بات نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

احرار کانفرنس نے بھی اس شعبہ کے لئے اپنی خدمات پیش کر دی ہیں جمعیۃ العلماء دہلی بھی خون پسینہ ایک کر رہی ہے کوئی دن جاتا ہے کہ ان طاقتوں کے عمل کا موثر با نتیجہ نکل آئے گا۔ مسلم عوام آہستہ آہستہ جدید قوم کا لقمہ بن جائیں گے اور عذر نہیں بلکہ ان کے محافظ ہی ان کو بھیڑیوں کے منہ میں پہونچا دیں گے۔ جب یہ کام بہت بڑے پیمانے پر ہو چکے گا تو نظام تمدن بدلا جائے گا۔ دنیا ہند کا آسمان نیا ہوگا زمین جدید ہوگی۔ اب اگر

اس نئی دنیا میں مسلم قومیت مسلم تمدن مسلم تہذیب کے ایسے دقیانوسی لفظ کوئی اپنی زبان پر لائیگا تو اس کا گلا گھونٹ دیا جائے گا ڈنڈوں سے اس کا دماغی بخار اتار دیا جائے گا۔ اور مسلمانوں کی گراں خوابی کی وہی تعبیر ظاہر ہو گی جو چند روز پہلے اسپین میں رونما ہو چکی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کا کام غلام پیدا کرنا ہے

پنڈت جی نے اپنے گردو پیش جو اسلامی تمدن کے آثار پائے تو ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھا سارے ہندوستان میں علیگڑھ کی سرزمین ایسی نظر آئی جہاں جدید علوم کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں میں مسلم تہذیب و تمدن کا تھوڑا بہت احساس بھی پیدا کر دیا جاتا ہے لہٰذا لگے سوچنے کہ کسی تدبیر سے اسلامیان ہند کی نظر میں مسلم یونیورسٹی کو قابل نفرت اور لائق ملامت بنا دیا جائے تو بطرز خاص مسلمانوں کے جوش حریت سے فائدہ اٹھانے کے لیے مسلم یونیورسٹی کو غلام ساز فیکٹری کا خطاب عنایت فرما دیا۔ مسٹر گاندھی بھی جس وقت راہ آزادی میں گام فرسا ہوئے تھے تو اس ادارے پر ہی ہاتھ صاف کرنا ضروری سمجھا تھا۔ پھر جب گرو جی کا یہ انداز ہو تو چیلا کب پیچھے رہ سکتا تھا وہ تو دو ہاتھ بڑھنے کی ہی کوشش کرے گا۔ ملاحظہ کیجئے۔

اس میں شک نہیں کہ علیگڑھ کالج نے بہت اچھا کام کیا قابل لوگوں کی ایک نسبتاً بڑی تعداد پیدا کر دی اور تعلیمیافتہ مسلمانوں

کا رنگ ہی بدل دیا۔ لیکن جن اصولوں پر اس کی بنیاد اول روز قائم کی گئی تھی ان میں پھر پوری طرح تبدیلی نہیں ہوسکی امیرانہ ذہنیت وہاں ہمیشہ کارفرما رہی اور ایک اوسط درجے کے طالب علم کا حوصلہ اور مقصد سرکاری ملازمت کے سوا کچھ نہیں ہوتا نہ اس میں تحقیق کا جذبہ ہے نہ تلاش اور جستجو کا حوصلہ اگر اس کو ڈپٹی کلکٹری مل جائے تو بس وہ خوش ہے اور مطمئن اس کا جذبہ افتخار اس سے مطمئن ہوجاتا ہے اگر اس کو یاد دلا دیا جائے کہ وہ جمہوریت اسلام کا ایک رکن ہے اور اپنے جذبہ اخوت کو نمایاں کرنے کے لئے وہ ایک سرخ ٹوپی ذرا ترچھی کرکے پہنتا ہے یہ ترکی ٹوپی کہلاتی ہے (حالانکہ خود ترکوں نے اسے بالکل ترک کردیا ہے) جمہوریت اسلام میں شرکت کا یہ ناقابل انکار حق یقینی طور پر حاصل کرنے کے بعد جس سے کہ اس کو دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کا حق مل جاتا ہے۔ اب اس کو اس کا مطلق فکر نہیں ہوتا کہ اس کے وطن ہندوستان میں سیاسی جمہوریت کا وجود بھی کہیں ہے کہ نہیں (میری کہانی صفحہ ۳۴۱-۲ جلد دوم۔

یہ ہے قوم پرستی کہ جس چیز کو ذرا بھی اسلام سے نسبت ہوجائے وہ قابل

ہزار لعنت ہاں بیشک اگر مسلم یونیورسٹی کا نام ہندو یونیورسٹی ہوتا تو بنارس کی طرح علیگڑھ سے بھی ایسے نوجوان پیدا ہونے لگتے جو غلامانہ ذہنیت سے آزاد ہوتے جن کا مطمح نظر صرف ملازمت نہ ہوتا جن میں تحقیق کا جذبہ ہوتا، تلاش کا حوصلہ ہوتا مگر چونکہ بدقسمتی سے اس کے نام کا پہلا جزو ہے "مسلم" لہٰذا یہاں جو بھی تعلیم حاصل کرتا ہے غلامی اس کے وجود میں راسخ ہوجاتی ہے اس کے دل و دماغ سے تحقیق و تفتیش کا مادہ ہی خارج ہوجاتا ہے وہ صرف ترکی ٹوپی کو طرۂ امتیاز بنالے پھرتا ہے کائنات حیات تصور کرتا ہے اور ٹوپی بھی کمبخت ایسی جو اسلامی ملک سے منسوب۔ اگر گاندھی کیپ آٹھی کرکے لگائی جاتی تو ایک بات بھی تھی۔ وطن پرستی کا سائن بورڈ سی سر پہ تیار ہوجاتا۔

نتیجہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ اگر آزادی چاہتے ہو تو پہلے مسلم یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجادو کیونکہ اس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے یہاں اسلامی یعنی فرقہ وارانہ امتیازات پرورش پلتے ہیں۔

کاش پنڈت جی مسلم یونیورسٹی کی طرح کچھ ہندو یونیورسٹی کے متعلق بھی زحمت فرماتے تو نیت کا حال ظاہر نہ ہوتا۔ مگر کیا کیا جائے ضمیر کی آواز بلند ہوکر رہتی ہے۔ جادو سر چڑھ کے بغیر رہ نہیں سکتا مسلم کشی کا جذبہ چھپائے نہیں چھپ سکتا۔

خاتمہ کلام | پنڈت جی کے مذہب کے خفی سے خفی خدوخال اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ معمولی عقل و فہم کا انسان بھی سمجھ لے گا کہ موصوف سخت ترین ہندو ہیں اور ان کا موجودہ مذہب وطن پرستی اور قوم نوازی کے پردے میں اسلام دشمنی اور مسلم کشی اور ہر اُس چیز سے نفرت ہے جو مسلمانوں سے انتساب رکھتی ہو۔ اس لئے کسی مزید تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ورنہ پنڈت جی کی دوسری تحریروں میں بہت کچھ سامان موجود ہے۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہست بتاں را کہ نام نیست

ملنے کا پتہ

مکتبۂ تعمیرِ ادب، ۱۷ لیک روڈ، لاہور

ملک مختار حسین، ۲۰ ایمپرس روڈ، لاہور

مولانا فخرالدین مہدی، ۲۸ علی مراد خیرپور

قیمت : ۱۵ روپے

مطبوعہ ظفر سنز پرنٹرز، ۹ - بی کوپر روڈ،
لاہور